دامنِ یوسف

فیض بنام سرفراز

فیض احمد فیض کے خطوط
بیگم سرفراز اقبال کے نام

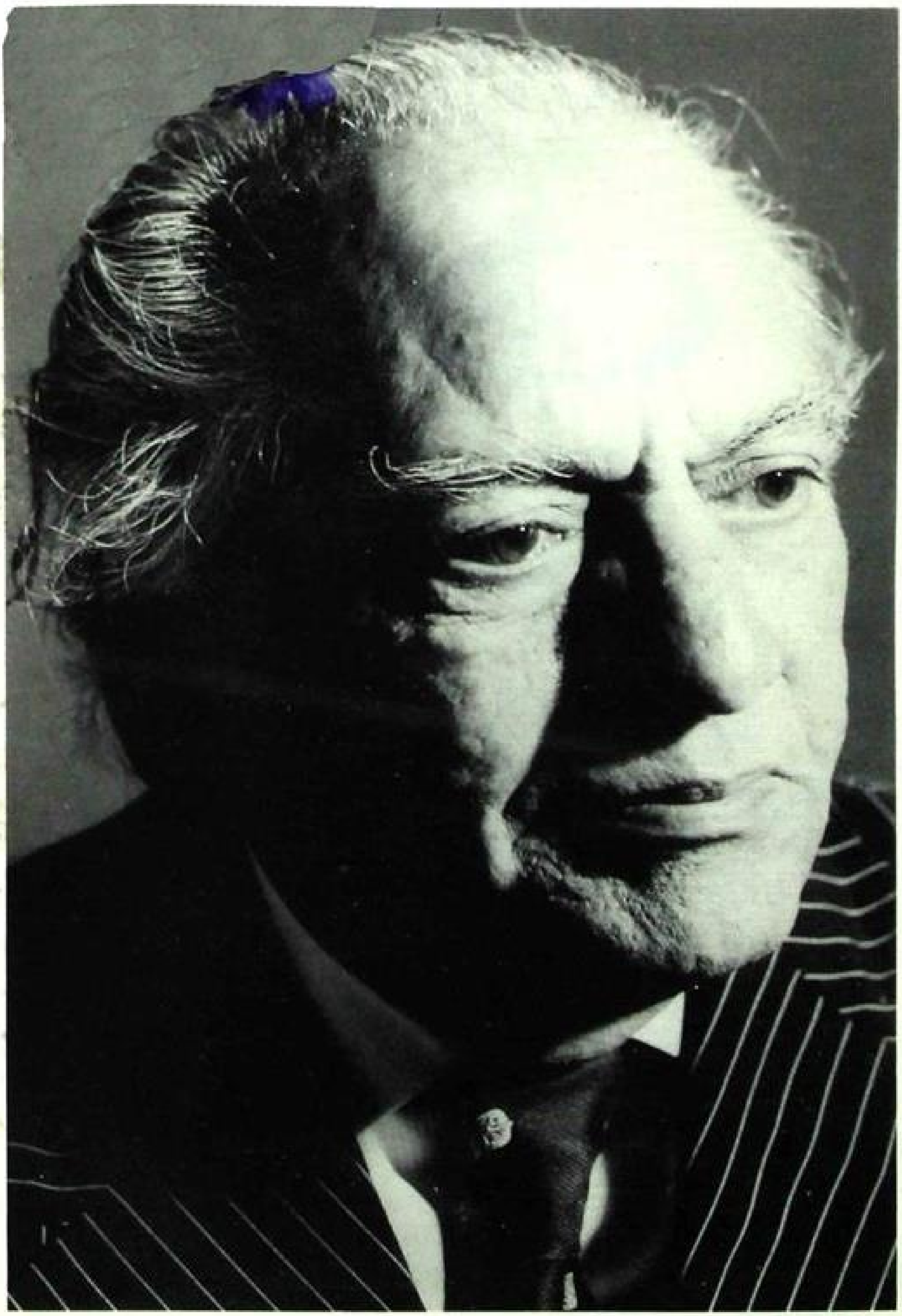

باذوق لوگوں کے لیے
ھماری کتابیں
خوبصورت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

ماورا

ضابطہ

ناشر : خالد شریف

خوش نویس : عبدالمتین

طابع : رشید احمد چوہدری

مکتبۂ جدید پریس، لاہور

ادارہ : ماورا پبلشرز بہاولپور روڈ لاہور
فون : ۲۱۱۴۱۱

بار اوّل : جنوری ۱۹۸۹ء

قیمت : ۷۰ روپے

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اِس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اُتر جائے

فیض

اپنے دوست، اپنے والد

حمید احمد کے نام

خلوص سے!

محترم اندر کمار گجرال کی نذر

سرفراز ۹ اپریل 1989

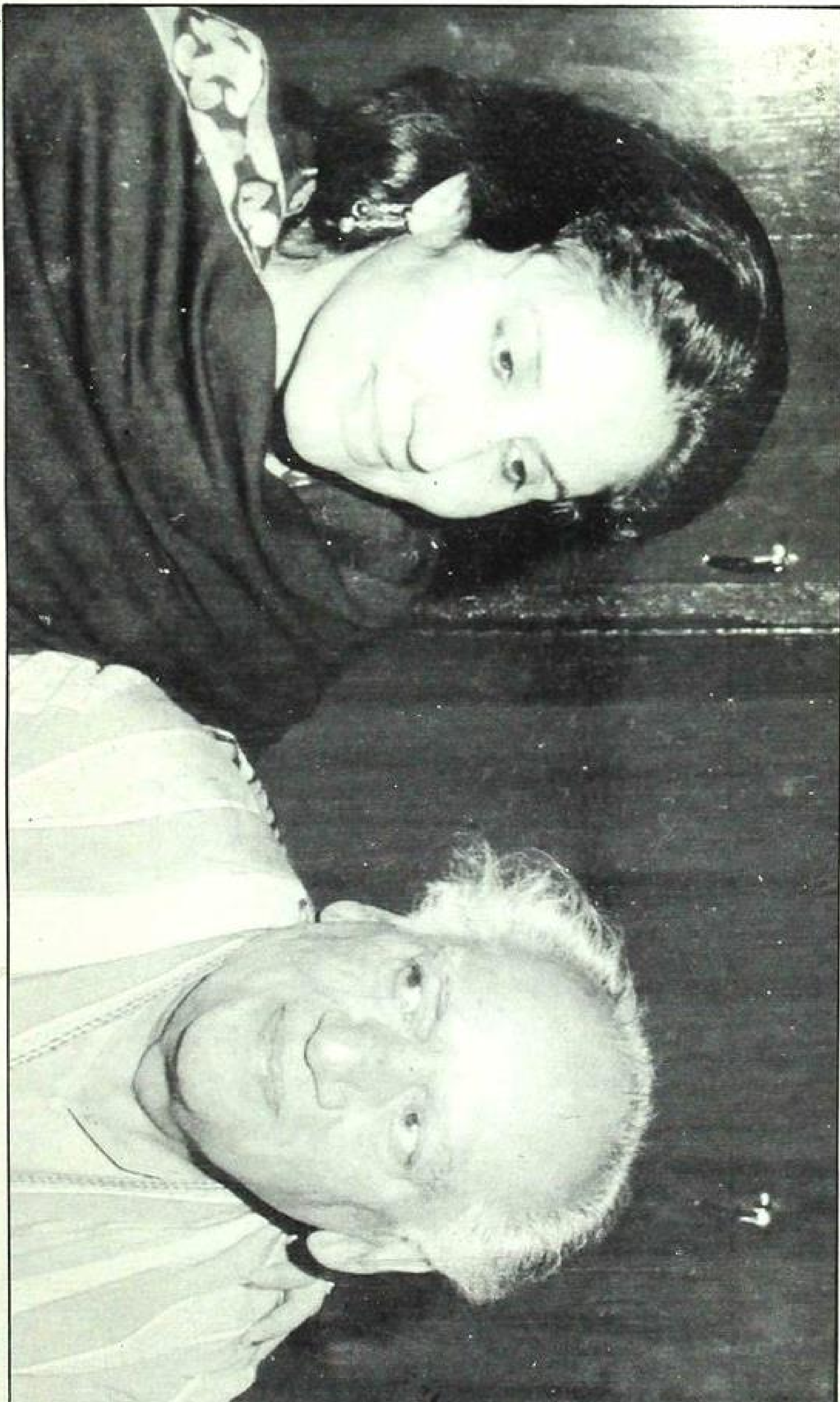

پیش لفظ

میں اِن خطوط کو شائع کرانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی —— ہاں، شاید کبھی نہیں —— کہ یہ میری ذاتی دولت تھی اور اپنی دولت سے کون محروم ہونا چاہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر افضل اقبال اور اسلامک یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر افضل جیسے مہربان دوستوں کے اصرار پر آج میں اس دولت کو سب کے حوالے کر رہی ہُوں۔

اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ فیض جیسے لوگ اور انکے اصول اور ان کے نظریات، انکی سوچیں اور انکی خواہشیں، انکی بزم اور انکی تنہائیاں، کہی اور اَن کہی باتیں —— جب یہ سب کچھ ان کا ذاتی نہیں ہوتا کہ یہ لوگ تو مجسّم، قوم کی امانت ہوتے ہیں تو پھر میں کیسے ان کی عقیدت میں گزارے ہُوئے لمحوں کی یاد کو اپنی ذاتی دولت قرار دے سکتی ہوں —— کہ خوشبو کو مُٹھی میں کس نے بند کیا ہے؟ اور چاند کی روشنی صرف میرے آنگن کی اسیر تو نہیں رہ سکتی۔

آج اس دولت کو عام کرتے ہوئے مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میرے دل میں جو عقیدت فیض صاحب کے لیے تھی اسے میں نے اپنے خطوں کے ذریعے اِن تک پُہنچا دیا تھا۔ اس محبّت اور عقیدت کے بدلے انھوں نے میرا مان بڑھایا اور اپنی خوشیوں اور اپنی اُداسیوں میں مجھے بھی یاد کرکے یہ احساس دلایا کہ ان تک میری عقیدت پہنچ رہی تھی۔

اِن خطوں کو فیض صاحب کے چاہنے والوں کے حوالے کرتے ہوئے میں اپنا یہ مان بھی SHARE کر رہی ہوں کہ ایسے عہد ساز صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر ایسے لوگ اپنائیت کا احساس دیں تو مجھ جیسے عقیدت مندوں کو اپنی خوش بختی پر ناز تو کرنا چاہیے نا! ــــ میں نے ہمیشہ دُکھ چھپائے ہیں، سُکھ اور خوشیاں سب کے ساتھ SHARE کرنے کی میری عادت ہے، ــــ آج میں اپنی اس عادت کو دُہرا رہی ہوں۔ میں نے یہ خط آپ کے سامنے لا کر رکھ دیے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ حالِ دل بھی بیان کر ڈالا ہے مگر مجھے شدّت سے احساس ہے کہ میں اس سکون، طمانیت اور محبّت کا کوئی کنارہ بھی اس کوشش کے دوران ظاہر نہیں کر سکی جو مجھے ان خطوط کی صُورت میں یوُں ملا جیسے دھرتی کو سات سمندر ــــ'

شاید وہ لوگ جو فیض پر وطن دشمنی کا لیبل لگاتے ہیں، وطن کی تڑپ ان خطوط میں محسوس کریں کہ وطن تو سب کی میراث ہوتی ہے۔ میں ادیب نہیں اور نہ ہی میں اس کوشش کو ادبی کارنامہ قرار دلانے کی خواہش رکھتی ہوں لیکن 'دامنِ یوسف' سے اگر کچھ ذہنوں میں وطن دشمنی اور اُصول پرستی کا فرق واضح ہو جائے تو یہی میری عُمر بھر کی کمائی اور فیض کے چاہنے والوں کی جیت ہے۔

'دامنِ یوسف' میں کچُھ خط ابنِ انشاء اور جناب سبطِ حسن کے بھی شامل ہیں۔ میرے نزدیک یہ ضروری تھا تاکہ کچُھ باتوں کی وضاحت ہو جائے جو دُوسری صورت میں شاید میرے عجزِ قلم کے باعث ممکن نہ ہوتا۔

میں ــــ کہ جسے اپنے جذبات کے اظہار کا سلیقہ نہیں اگر اس کتاب کو ترتیب دینے میں کہیں ٹھوکر کھا گئی ہوں تو ناواقفِ آدابِ تحریر، جان کر درگزر کر دیں کہ میں تو اُس وقت بھی' جب فیض صاحب کی جُدائی کا سانحہ گزرا، چند سطریں ضبطِ تحریر میں نہ لا سکی تھی اور آج بھی ان کی دائمی جدائی کے صدمے یاد کرتی ہوں تو فقط انہی کی نظم کے یہ مصرعے دُہرا لیتی ہوں جو ایک بار اُنھوں نے اپنے خط میں لکھے تھے ــــ'

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سُورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچے میں کسی حُسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
شاید وہ کوئی وہم تھا، ممکن ہے سُنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اب بیر نہ اُلفت نہ کوئی ربط نہ رشتہ
اپنا کوئی تیرا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل، یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمّت کرو، جینے کو تو اِک عمر پڑی ہے

ان آخری دو مصرعوں کو یاد کر کے مجھے ہمیشہ یوں لگتا ہے جیسے فیض صاحب مجھے دُکھی جان کر پُرچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب کے لیے سحر صدیقی اور تدوین و تکمیل کے لیے خالد شریف اور مستنصر جاوید کی شکر گزار ہوں۔ اپنے شوہر محمّد اقبال کی بھی ممنون ہوں جن کے تعاون کے بغیر شاید یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ یہاں اپنے ان احباب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کے مشورے قدم قدم میری راہنمائی کرتے رہے۔

سرفراز

۸ راگست ۱۹۸۸ء

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

فیض ۵ ستمبر ۶۴ء

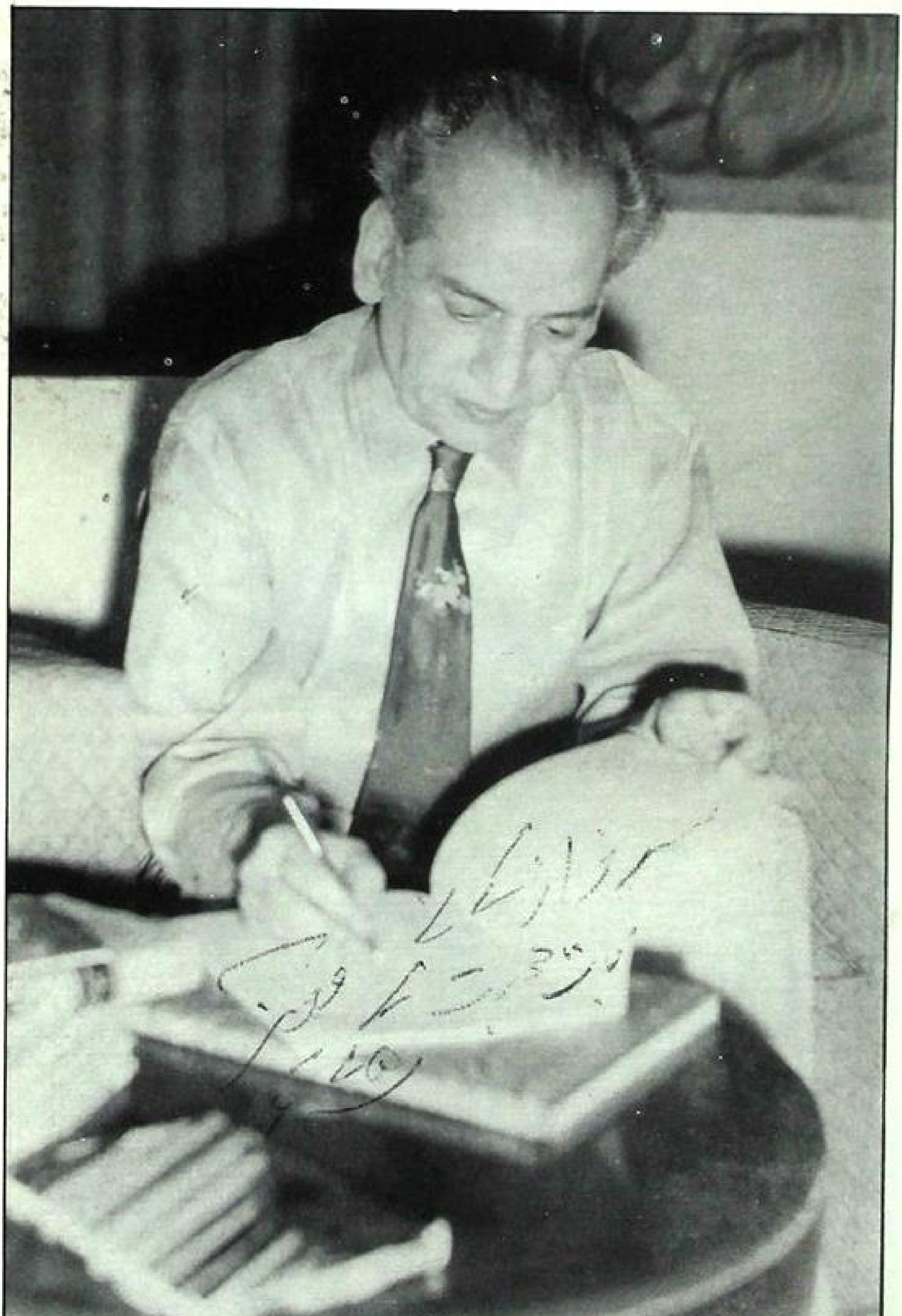

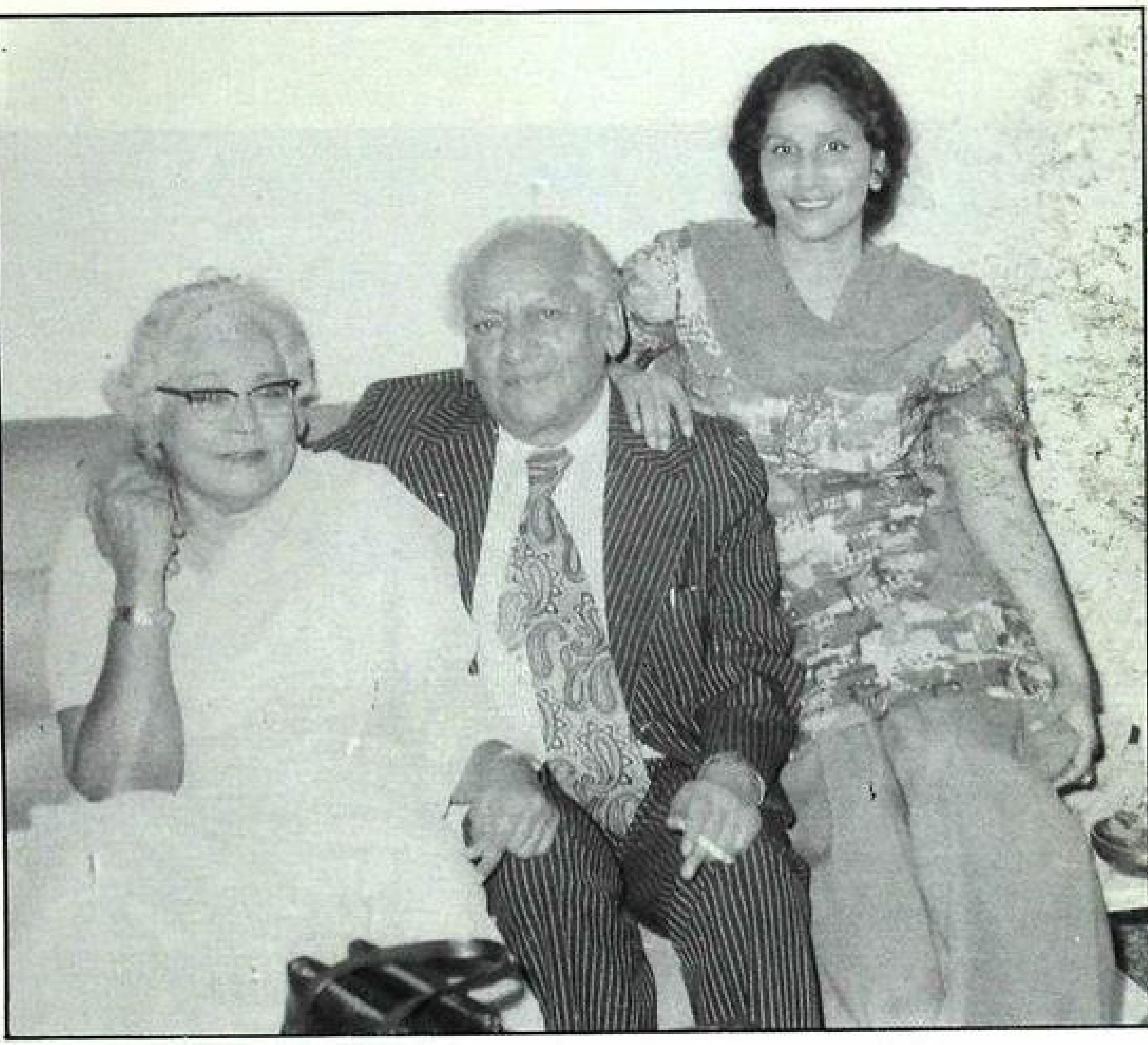

مَیں اور عصمت چغتائی ـــــــ ۱۹۷۶ء

مینا، میری بیٹی اور طفیل مرحوم (مدیر نقوش) ـــــــ ۱۹۷۷ء

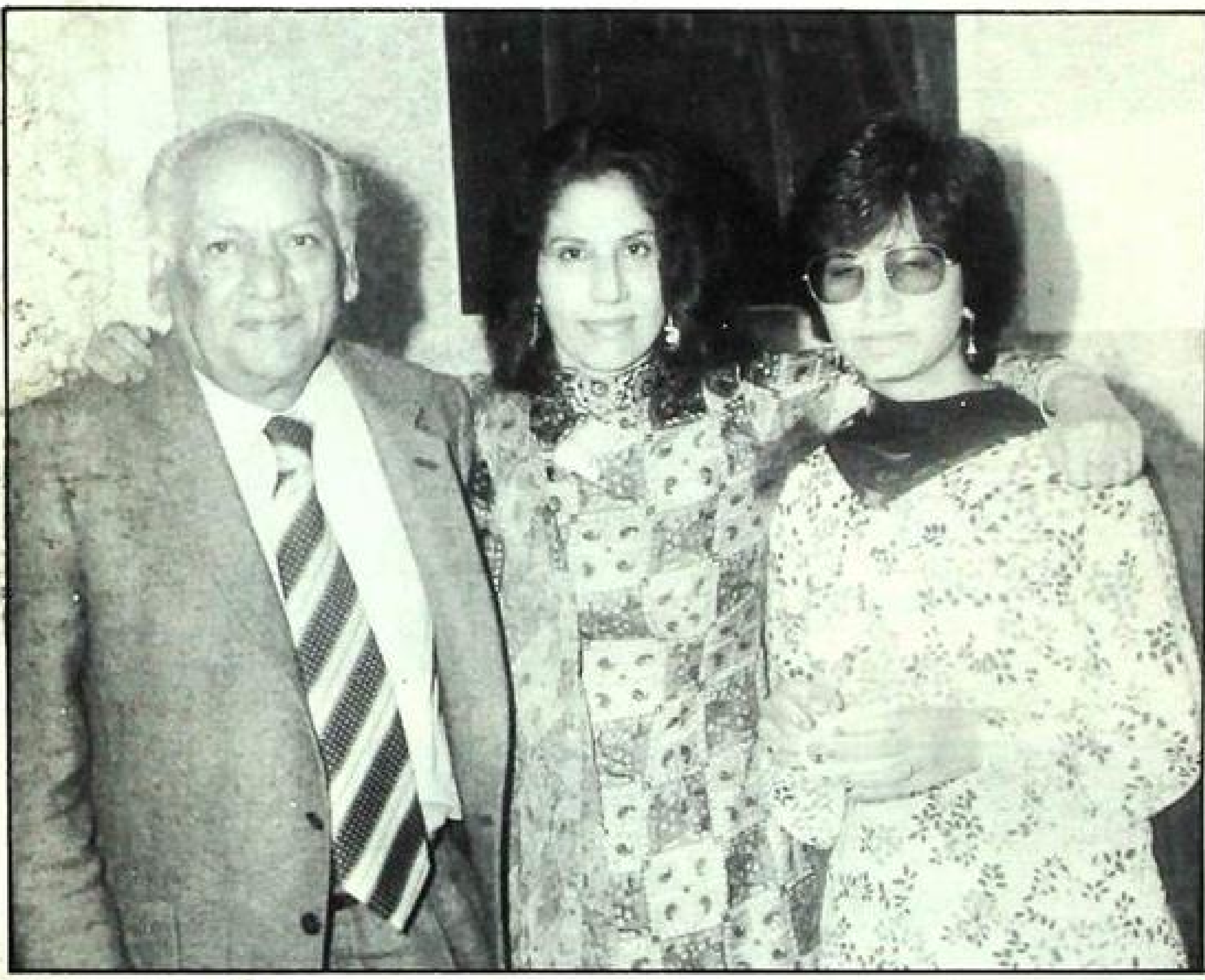

میں اور میری بیٹی مینا ـــــ ۱۹۸۲ء

انتقال سے ایک سال پہلے میرے گھر میں ـــ ۱۹۸۳ء

میرا بیٹا اور میں ــــ
بوربن ۱۹۷۲ء

میری دونوں بیٹیاں مینا
اور مانو، مسز اظفر، مَیں اور
مسز فیض ــــ باڑیاں ۱۹۷۳ء

بیگم نسیم اور میرے ساتھ میرے گھر میں ــــ ۱۹۸۱ء

عشق دل میں رہے تو رُسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

فیض

یہ ۱۹۷۰ کی بات ہے۔

کوئٹہ میں مارچ اور اپریل کے اُداس مہینے دھیمی رفتار سے گزرتے جارہے تھے میرے مکان کے آنگن میں بادام کے درختوں پر سفید پھول خاموش موسموں کی چاپ سنتے رہتے تھے۔ ہوا میں بے نام رُتوں کی باس رچی ہوئی تھی اور آنے والے موسموں کا انتظار کچھ زیادہ ہی جان لیوا محسوس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھار تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے کھڑے پہاڑ انتظار ختم کر کے اب اپنے گھروں کو واپس چل دیں گے۔ شام ہوتے ہی یہ احساس اور زیادہ شدید ہونے لگتا تھا۔

میں یہ موسم کافی اور کتابوں کے ساتھ بسر کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اچھا شعر ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ میں شاعر کے تجربے کی کیفیت کو کافی کی کڑواہٹ میں آمیز کر کے آہستہ آہستہ رگوں میں اتارنے کو سب سے بڑی تفریح سمجھتی ہوں۔ شروع ہی سے میری زندگی کا ماحصل ع فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے رہا ہے اور شاید زندگی کی جانب اسی رویے نے آنے والے دنوں میں ایسے ایسے گہر ہائے آبدار میری جھولی میں بھر دیئے جنہوں نے میری پوری زندگی کو تابناک بنا دیا۔

ایک دن اچانک فون کی گھنٹی بجی، میں نے پوچھا کون؟

جواب ملا: فراز بول رہا ہوں۔

فراز سے ہمارے گھرانے کے پرانے تعلقات ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا:

"آج میں تمہاری بات ایک ایسے شخص سے کرا رہا ہوں جس کی تم مداح ہو۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا:

"مگر تم بول کہاں سے رہے ہو؟"

آواز آئی: "میں تو لاہور ریڈیو سٹیشن سے بول رہا ہوں ـــــ بہرحال تم فیض صاحب سے بات کرو ـــــ لو کرو بات اب۔"

فیض صاحب ـــــ!

مجھے یکدم بادام کے پھول تالیاں بجاتے ہوئے محسوس ہوئے جیسے خاموش گزرتا موسم مسکرانے لگا ہو، پہاڑوں نے ایک گہرا سانس لیا ہو ـــــ اطمینان کا سانس ـــــ! اس وقت میرے سامنے چند کتابیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک دست صبا بھی تھی۔ تب مجھے اس چھوٹی سی کتاب کے سارے الفاظ ہاتھ کی لکیروں میں اترتے محسوس ہوئے۔

اُسی لمحے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی سرگوشی میرے کان میں اتری۔"فیض" آواز نے کہا تھا اور یہ اُس کی آواز تھی جس کی میں پرستار ہوں۔

"ہیلو"۔ دُور سے آتی ہوئی آواز کچھ اور قریب ہو گئی تھی۔ "ہیلو"؟ کیسے مخاطب کروں، کیا کہوں ـــــ ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ـــــ فراز تم بہت خراب ہو، مجھے بتا تو دیتے، فیض صاحب سے بات کرنے کے لئے میں کچھ لفظ اور حواس تو جمع کر لیتی، مجھے تو حبس میں ٹھنڈی پھوار نے اچانک آن لیا تھا۔ درمیان سے آندھی غائب تھی۔ یہ امن اور وفا کا شگون ہے، میں نے سوچا تھا اور اس سوچ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ مجھے میری آواز واپس مل گئی تھی، اطمینان کا گہرا سانس، اور میں نے کہا تھا: فیض صاحب، السلام علیکم! دوبارہ خاموشی کا طویل وقفہ، اور یہ طوالت صرف میں محسوس کر سکتی تھی ورنہ دُوسری طرف سے کوئی جواب آنے سے پہلے میں کہہ رہی تھی اسی شوخ روانی کے ساتھ جیسی کہ میں ہوں۔

"فیض صاحب، آپ زیارت میں تین دن رہ کر چلے گئے، مجھے بعد میں معلوم ہوا ورنہ میں ضرور ملنے آتی۔"

دوسری طرف سے وہی نیند میں ڈوبی ہوئی شفقت سنائی دی: لو بھئی، ہم تو سوچتے تھے کہ صرف سی آئی ڈی ہمارے پیچھے پھرتی ہے۔ اب پتہ چلا تم جیسے لوگ بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اچھا۔ اپنا نام تو بتاؤ۔؟

جس کی خواہش تھی اس کے اچانک مل جانے کی خوشی نے میرا اعتماد بڑھا دیا تھا۔ جی! آپ فراز کو عزت سے بُلا لیجئے۔ اور انہوں نے فراز کو عزت سے بلا کر ریسیور دوبارہ اُسے تھما دیا اور میں اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ "میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو"—

"صرف اتنی بات کرنی تھی فیض صاحب سے؟" مجھے فراز کے لہجے میں طنز لگا تھا۔

"لیکن یہ بیچ میں تم کہاں سے آن ٹپکے؟ میں نے تو ابھی فیض صاحب کو اپنا نام ہی بتایا تھا۔"

"لیکن تمہارا نام ایسا تو نہیں کہ جسے سُن کر بات آگے نہ بڑھ سکے۔"

"نہیں، اُنہوں نے میرا نام پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا فراز کو عزت سے بلا لیجئے۔ عزت یعنی سر (Si R) - اور فراز - سرفراز۔"

"اور فیض صاحب نے بڑی عزت کے ساتھ ٹیلی فون میری طرف بڑھا دیا۔" یہ کہہ کر فراز نے حسبِ عادت زوردار قہقہہ لگایا اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

فراز نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ تمہارا نام ایسا تو نہیں جسے سُن کر بات آگے نہ بڑھ سکے۔ بات آگے بڑھی اور یوں میری زندگی کے ایک ایسے دَور کا آغاز ہوا جس کے روز و شب میں ان چند لمحوں کی گفتگو کا بڑا گہرا اور مستقل تعلق رہا۔ پھر اس کے بعد تو میرے لئے فیض صاحب کی باتیں، حبس کے بے انت موسموں میں ہمیشہ ٹھنڈی پھوار کی مانند رہیں۔

فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد، میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔

اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں یا پھر اُڑتے بادلوں کی نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں۔

میری سوچ کی اسی 'جاگو میٹی' میں سال نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی سال کو اتنی تیزی سے گزرتے نہیں دیکھا۔

کچھ عرصے بعد کراچی جانا ہوا۔ وہاں کا موسم مجھے کبھی اچھا نہیں لگا لیکن اس بار کراچی کے کسیلے موسم کا مزاج کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ میں نے فیض صاحب کو فون کیا، وہ ان دنوں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے۔

"فیض صاحب، ٹھیک ہے ہمیشہ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس جاتا ہے لیکن کیا آج ایسا نہیں ہو سکتا کہ جذبے کی صداقت کنوئیں کو سرکا دے اور میری آپ سے ملاقات کی خواہش پوری ہو جائے۔"

یہ سنتے ہی انہوں نے ایک معصوم سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہے ہوں۔ بس، اتنی ذرا سی بات۔ جیسے انہیں اس سے زیادہ مطالبے کی توقع رہی ہو۔

"ٹھیک ہے بھئی، ہم پانچ بجے انٹر کان پہنچ جائیں گے۔"

"جی شکریہ۔ میں لاؤنج میں انتظار کروں گی۔" اور یوں نے پانچ بجے میں انٹر کان کے لاؤنج میں تھی۔

میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ انتظار کرنے کی مجھے عادت نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ انتظار کرب کی سب سے سنگین منزل ہے۔ تو گویا میں نے سنگین منزلوں کی طرف سفر کا آغاز کر دیا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا، اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میں خواب میں چل کر یہاں تک پہنچی ہوں۔

"یہاں فیض صاحب کیوں آئیں گے اور وہ بھی میرے لئے"۔ شک نے کرب کا دروازہ کھول دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس دروازے سے اندر جھانک کر دیکھتی' اچانک میرے سامنے سفید فوکس ویگن رُکی، دروازہ کھلا، اندر سے ایک شخص اُترا۔ وہ عام سا آدمی تھا مگر مجھے منفرد لگا۔ جیسے وہ سب جیسا ہو مگر کوئی اس جیسا نہ ہو۔ میں نے دیکھا شک کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے اور میں نے یقین کر لیا یہی فیض صاحب ہیں۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔ میری بہن اور بہنوئی بھی ساتھ تھے، وہ بھی ملے۔

فیض صاحب خاصے خوش دکھائی دیتے تھے۔ مجھے سکون اور حوصلہ میسّر آیا۔ ہم ایک ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے اور چائے کے لئے کہا، ساتھ میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔

میں نے پوچھا تھا: "آپ کراچی میں کیوں رہتے ہیں؟"

وہ حیرت سے بولے: "کیا مطلب؟"

"آپ کو لاہور میں رہنا چاہیئے، وہاں کا موسم بہتر ہے، آپ کے لئے۔" میں نے وضاحت کی۔ وہ بولے:

"ہم ایوب دورِ حکومت میں دو سال باہر رہ کر آئے تھے، واپسی پر ہماری دوست شوکت ہارون نے اصرار کر کے ہمیں یہیں روک لیا، اور ہم ان کی خواہش پر رُک گئے، ویسے اب جائیں گے لاہور ــــ!"

چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی اور معصوم باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ویٹر بل لے آیا۔ سچ کہتی ہوں، مجھے یوں لگا جیسے ابھی اُس نے چائے بھی سرو نہ کی ہو اور پہلے ہی بل لے آیا ہو۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے کہ فیض صاحب نے ہاتھ بڑھا کر بل لے لیا۔

"لیکن ہمیں یہاں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوتی ہے کہ یہ بل ....."

"ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے باجی!" میری بہن نے ہولے سے میرے کان میں کہا۔

اُس روز پہلی بار میں نے اپنی آنکھوں سے وقت کو پر لگا کر اُڑتے دیکھا۔ میں نے فیض صاحب سے ضد کی کہ بل میں ادا کروں گی۔

"ہم جب تمہارے شہر میں آئیں گے تو خاطر کر لینا، اب نہیں"۔ فیض صاحب نے بڑی شفقت سے منع کر کے بل ادا کر دیا۔

یہ پہلی ملاقات تھی جو ختم ہو گئی تھی۔ ایک عام سی ملاقات لیکن میرے دل، میرے ذہن پر اس ملاقات کا جو نقش ثبت ہوا، اس کے بعد ہونے والی ملاقاتیں اسے ماند نہ کر سکیں۔ کتنا خاص آدمی، کتنا عام سا لگتا ہے، میں نے سوچا تھا، کوئی ناز کوئی ادا بڑے آدمیوں والی نہیں۔ اس روز فیض صاحب سے مل کر مجھے ایک لحظہ کے لئے تو یوں لگا تھا جیسے کسی قدیم یونانی دیوتا کا بُت اچانک اپنی آنکھیں جھپکنے لگا ہو۔

میں نے واپس کوئٹہ جا کر فیض صاحب کو کراچی خط لکھا جس میں ان سے تصویر کی فرمائش بھی تھی۔ جس کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا:

عزیزی، دُعا

آپ کا خط بہت دن ہوئے ملا تھا، لیکن کوئی تصویر ہاتھ نہیں آ رہی تھی یہ شوق یا تو فلمی ستاروں کو ہوتا ہے یا نوجوانوں کو کہ 'FANS' کے لئے بہت سی تصویریں بنوا کر رکھیں، بہر صورت آج یہ تصویر دستیاب ہوئی جو بھیج رہا ہوں۔

آپ کی محبت اور خلوص سے بہت دل خوش ہوا۔ انشاءاللہ پھر کبھی ملاقات ہو گی اور تم نے اپنا پورا نام بھی نہیں لکھا، اب کے لکھ دینا۔

فقط
مخلص
فیض

یہ فیض صاحب کا میرے نام پہلا خط تھا۔ جس دن مجھے یہ خط ملا تھا، میں اُس بچّے کی طرح خوش تھی جس کو امتحان میں پاس ہونے پر شاباش کے طور پر اس کی پسندیدہ میڈم نے پھول انعام میں دیا ہو یا جیسے اولمپکس کے میدان میں کوئی ایسا کھلاڑی سونے کا تمغہ حاصل کرے جس کا کوئی شناسا یا ہم وطن بھرے سٹیڈیم میں موجود نہ ہو۔ اور تالیوں کے اجنبی شور میں وہ بیک وقت مسکرانے اور رونے لگے۔

میں نے شام تک فیض صاحب کا خط کئی بار پڑھا۔ ہر بار اس کی خوشبو نئی محسوس ہوتی تھی۔

اس خط کے جواب میں میں نے فیض صاحب کو دو خط یکے بعد دیگرے لکھے میرا جی چاہتا تھا کہ یہ خط خوب طویل ہوں، ڈھیروں باتیں کاغذ پر یوں اتار دوں جیسے شام کے فرش پر ستارے اترتے ہیں، لیکن جب لکھنے بیٹھتی تو یکدم آنکھوں کے سامنے فیض صاحب کا چہرہ آجاتا، خط پورا نہ ہوتا۔ ادھورا چھوڑ دیتی۔ چنانچہ انہوں نے میرے دونوں خطوں کا یوں جواب لکھا:

۲۴ اکتوبر

عزیزی سرفراز

آپ کے دو مختصر خطوط ملے تھے۔ آپ کی فرمائش ملفوف ہے۔ خاص اچھی نہیں لیکن ہمیں فلم اسٹار ہونے کا دعوٰی کب ہے وہ تو جوانی میں بھی نہیں تھا۔

میں مری سے واپسی پر رات بھر کے لئے پنڈی ٹھہرا تھا۔ آپ کا پتہ اور وقت غیر مساعد تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ اب کبھی آنا ہوا تو آپ کو پہلے سے مطلع کرنے کی کوشش کروں گا۔

ادب اور ادیبوں سے آپ کی شکایات کی تفصیل تو مجھے نہیں معلوم لیکن زندگی یا زمانے سے شکایت کسے نہیں، اور اس کے باوجود شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

اقبال[1] صاحب اور بچوں کو دُعا۔

فقط
مخلص
فیض

فیض صاحب نے خط کے ساتھ دراصل اپنی تصویر اور نظم کی فوٹو کاپی ارسال کی تھی۔
اس نظم پر فیض صاحب کے ۵ ستمبر ۱۹۶۴ء کے دستخط ثبت تھے۔ نظم یہ تھی:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

اس کے چند ہفتوں کے بعد اچانک مجھے پشاور جانے کا اتفاق ہوا۔ فراز سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہاں سائنس کانفرنس ہو رہی ہے اور اس میں فیض صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ خوشی سے میں سرشار ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ فراز نے قہوے کا آرڈر دے دیا تھا مگر میں نے کہا: اب قہوے کی ضرورت نہیں، بس مجھے فوراً فیض صاحب کے پاس لے چلو۔

فیض صاحب ڈینز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اجمل بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میں اور فراز ان کے پاس جا دھمکے۔ فیض صاحب اس اچانک اور غیر متوقع آمد سے بہت خوش ہوتے۔ ہم چاروں نے ہوٹل سلاطین میں کھانا کھایا۔ اس دوران اچانک فیض صاحب

۱۔ میرے شوہر کا نام۔

نے ایک کاغذ پر فی البدیہہ یہ مصرعہ لکھا اور اپنے دستخط کے ساتھ مجھے دے دیا۔

"فراز اوج کو پہنچے تو سرفراز ہوتے"

فراز آج تک اس مصرعہ کی تاب نہیں لا سکا۔

اس وقت میں کچھ پریشان سی تھی، میں نے اس کا قطعاً اظہار نہیں کیا بلکہ ہنستی مسکراتی رہی۔ لیکن فیض صاحب کی نظروں نے میری ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا۔ بہت ہی شفقت سے بولے: "کھانا کھاتے ہوئے کوئی بات ذہن میں نہیں رکھتے"۔

تب مجھے احساس ہوا کہ فیض نے میرے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے، وہ واقعی اہلِ نظر ہیں۔ چہرے کے ساتھ میرا ذہن بھی کھل اٹھا۔ میں نے خود کو اس مسافر کی طرح محسوس کیا جس کا سارا بوجھ اس کے ہم سفر نے اٹھا لیا ہو۔ اگلے روز میں راولپنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لئے اس روشن ستارے کی مانند تھے، اندھیری رات کے مسافر جس سے راہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی مجھے کوئی مشکل ہوگی میں ان سے ضرور مشورہ کروں گی کیونکہ یہ وہ شخص ہے جو مجھے یوں محسوس کر سکتا ہے جیسے میں خود کو محسوس کرتی ہوں۔

اس کے بعد میں راولپنڈی چلی آئی۔ معلوم نہیں کیا بات تھی وہ بڑی اُداس رُت تھی جی چاہتا تھا کہ انسان سب سے الگ تھلگ کسی پہاڑی کے دامن میں آبشار کے نزدیک ایک کٹیا میں رہنا شروع کر دے۔ شہد کی مکھیوں، سیب کے پھولوں، آوارہ خرگوشوں اور اقبال بانو کی آواز میں فیض کی غزلوں کے سوا کچھ آس پاس نہ ہو۔ شاید اس پژمردگی کا ایک سبب بعض دوستوں کا رویّہ تھا۔ وہ واقعی ایسے تھے جیسے میں نے محسوس کیا یا پھر میرا مشاہدہ اور تاثر غلط تھا۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔

ان دنوں ملک کے سیاسی حالات بھی ایک المناک ڈگر پر چل پڑے تھے۔ سیاست کے اسرار و رموز سے آگہی نہ سہی مگر میں بہر حال اس کو ایک مقدس اور معتبر منصب تصور کرتی

ہوں چنانچہ جب ذاتی مفاد یا عناد میں اس اہم اور ذمہ دار احساس کو تباہ ہوتے دیکھتی تو بلاشبہ دل ہی دل میں اس کا احساس یوں گزر جاتا جیسے کوئی بچہ بلیڈ سے پنسل تراشنے لگے تو بے احتیاطی سے اس کی انگلی کٹ جائے۔ میں نے فیض صاحب کو ایسے ہی ماحول اور ذہنی کیفیت میں خط لکھا جس کا کوئی جواب نہ ملا۔ مجھے چونکہ جواب کا شدت سے انتظار تھا لہٰذا جواب نہ ملنے کو کسی حد تک محسوس کیا۔ یہ جانے اور سمجھے بغیر کہ فیض صاحب نے اگر جواب نہیں دیا تو ایسا بے سبب نہیں ہوا ہوگا۔ بہرحال ایک دوپہر جب میں لان میں بے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دینے میں مصروف تھی، اچانک فیض صاحب کا یہ خط ملا:

۳۱ رنومبر

عزیزی سرفراز

عید مبارک

تمہارا گذشتہ خط کہیں کاغذات میں غائب ہو گیا تھا اس لئے جلد جواب نہ بھجوا سکا۔ آج ہی برآمد ہوا ہے۔ پشاور مجھے کوئی خط نہیں ملا اور پنڈی ملاقات نہ ہو سکنے میں جذبہ یا خلوص کی کمی کو دخل نہیں تھا۔ صرف ایک رات کے قیام میں واقعی کوئی صورت نہ تھی۔ خیر اب کے سہی۔ دسمبر کے وسط یا آخر میں غالباً آنا ہوگا۔ اور ممکن ہوا تو آپ لوگوں کو پہلے سے مطلع کروں گا ورنہ وہاں پہنچ کر سہی۔ دنیا والوں سے تمہاری شکایت کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہیں آئی۔ ویسے شاعر اور غیر شاعر مخلوق میں کچھ ایسا فرق نہیں ہوتا۔ بڑے چھوٹے یا مخلص غیر مخلص لوگ شاعر بھی ہوتے ہیں غیر شاعر بھی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ شاعر کو اپنے شعر میں جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ لیکن ایک عام شخص کے بارے میں بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اپنی روزمرہ نثر میں جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے اور اگر آدمی ایک شاعر کی ذات کے بارے میں غلط اندازہ کر سکتا ہے تو یہی غلطی کسی غیر شاعر کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے۔ اگر دوستی اور خلوص میں یہ اندازہ غلط ہو جائے تو

اس سے دُکھ ضرور پہنچتا ہے لیکن اسی لئے تو کہا ہے کہ "بربادیِ دل جبر نہیں فیض کسی کا"۔ بہر حال اگر کسی رفاقت سے مختصر عرصے کے لئے بھی کوئی راحت میسّر آجاتے تو غنیمت سمجھنا چاہیئے خواہ اس کی قیمت بعد میں غیر مناسب ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ خیر یہ تو سب کتابی باتیں ہیں۔ ہر کسی کا اپنا اپنا تجربہ ہے۔ لو کافی باتیں ہوگئیں۔ باقی ملاقات پر سہی۔ سب کو دعا۔

فقط

فیض

یہ پہلا خط تھا جس میں انہوں نے 'فقط' کے بعد مخلص نہیں لکھا بلکہ صرف فیض لکھا۔ یہ انداز بعد میں ان کے بیشتر خطوط میں دیکھنے کو ملا۔ بہر حال فیض صاحب کی "مختصر عرصہ کے لئے رفاقت" والی نصیحت کو میں نے پلّے سے باندھ لیا اور اپنی محبّتوں کے بدلے اور جواب کی آس لگانا چھوڑ دی۔ میں نے یہی سمجھ لیا کہ محبّت خوشبو ہے اسے جگنو کی طرح مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ اسی عرصہ میں سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ بھی رُونما ہوا جس کا میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ میں اس کا اظہار فیض صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر کرتی رہی۔ یحییٰ خاں نے اقتدار کی باگ ڈور ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دی اور وہ اپنے عوامی انداز میں حکومت چلانے لگے اور فیض صاحب کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ ثقافت اور فنونِ لطیفہ کی مدد سے عوامی اُمنگوں کی ترجمانی اور تہذیبی ورثہ کی حفاظت ایسے اہم فرائض بھٹو صاحب فیض صاحب کو سونپنا چاہتے تھے اس سلسلے میں فیض صاحب کو متعدد بار اسلام آباد آنے کی زحمت دی گئی۔ ایک بار وہ آئے تو ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں نے شکوہ اور شکایت بھرا خط انہیں لکھ ڈالا۔

جواب میں اُنہوں نے لکھا:

کراچی

۱۰ فروری

عزیزی سرفراز

آپ کا خط ملا۔ بھئی شکایت تو مجھے کرنی چاہیئے تھی۔ آپ کو شکوہ کیسا؟ جس رات میں وہاں پہنچا ہوں اس سے اگلے دن اقبال کا فون آیا کہ آپ لوگ شام کو آئیں گے۔ چنانچہ میں نے انتظار کیا۔ اس سے اگلے دن میں قریب قریب سب وقت اسلام آباد میں تھا۔ شام کو لوٹ کر پھر انتظار کیا۔ ہوٹل والوں سے بھی دریافت کیا کہ کوئی پیغام تو نہیں ہے تو جواب نفی میں ملا۔ ہفتے کی صبح اقبال کو ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دفتر ہی نہیں آئے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید آپ لوگ کہیں شہر سے باہر چلے گئے۔ اسی سہ پہر کو میں چلا آیا اس لئے ملاقات نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے۔ بہرحال تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہم نے ہرگز ترک نہیں کیا جب بھی آنا ہوا تمہاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی۔ ۱۳ فروری تو اب یہیں گزرے گی۔ لیکن اس کے بعد جب بھی طلبی ہوئی تمہیں مطلع کر دوں گا۔

اقبال صاحب اور بچوں کو دعا۔

فقط

فیض

خط پڑھنے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتی رہی کہ فیض صاحب کس قدر سچے اور سچے ہیں۔ اس قدر عظیم شخص کس محبت کے ساتھ وضاحت کر رہا ہے ورنہ اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے خط پانے کے بعد فیض صاحب کو کراچی فون کیا، مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھے ملیں تو میں ان کو یہ خط واپس کروں یا پھر ڈاک سے یہ لکھ کر واپس کر دوں کہ مجھے "یہ وضاحت بھرا خط قبول نہیں"۔

لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ حصّہ واپس لے لو جو ندی کے پانی کی بجائے اُداس ہوا میں تیرتا جارہا ہے۔

میں نے فیض صاحب کو کچھ دن کے بعد خط لکھا مگر جواب نہ ملا، البتّہ ایک دوست کے توسّط سے پیغام ملا کہ وہ (فیض صاحب) پنڈی آرہے ہیں۔ چنانچہ ان کی آمد پر ملاقات ہوئی اور خط کا جواب زبانی وصول کر لیا۔ فیض صاحب نے مجھے کھانے پر بلایا۔ وہ پنڈی میں ہوٹل فلیش مین میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگ پہنچے تو فیض صاحب موجود نہیں تھے۔ البتّہ ان کا یہ پیغام ملا :

عزیزی سرفراز

افسوس ہے کہ آج ایک بجے ہماری بھٹو طلبی ہوگئی ہے اس لئے تمہیں کھانا نہیں کھلا سکیں گے۔ (اور تمہیں اطلاع دینے کی بھی کوئی صورت نہیں)، اس لئے تم شام کو پانچ ساڑھے پانچ یا کل صبح نو دس بجے تک ملاقات اٹھا رکھو۔ SORRY

فیض

ملاقات پر فیض صاحب نے بتایا کہ بھٹو صاحب نے انہیں اچانک بُلا لیا تھا اور انہیں سرکاری طور پر پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس (اب ادارۂ ثقافت پاکستان) کے چیئرمین کا عہدہ سونپا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دوستوں کے لئے یہ مسرّت اور خوشی کی بات تھی۔ چنانچہ ہم نے ان سے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ اس عہدے کو قبول کر لیں کیونکہ ہمیں علم تھا کہ فیض صاحب درویش صفت ہیں۔ ان کو تو اس عہدے یا کسی عہدے کی کوئی ضرورت نہیں البتہ اگر انہوں نے اس عہدہ کو قبول کر لیا تو اس سے اس عُہدہ کے وقار اور شان میں اضافہ ہوگا۔

واقعی ایسا ہی ہوا۔ فیض صاحب نے اس ادارے سے وابستہ ہونے کا اعلان کیا

اور اس کے ساتھ ہی یہ ادارہ اپنی شناخت اور تشخص کی سمت تیزی سے آگے بڑھنے لگا مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے اس ادارے کی ترقی اور سفر کے لئے فیض صاحب نے دن رات ایک کر دیا۔ وہ آرام کی پرواکئے بغیر پوری یکسوئی کے ساتھ اس کے مقاصد پورا کرنے کے لئے ہمہ وقت مصروف رہنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے اس ادارے میں جوہرِ قابل اکٹھا کر لیا۔ ایسے پُرعزم اور باصلاحیت لوگ جمع کر لئے جو اپنے اپنے میدانوں میں اپنی محنت اور ذہانت کے لئے مشہور تھے۔

اکتوبر ۱۹۷۲ء میں فیض صاحب ایک ثقافتی وفد کے ہمراہ ایران کے دورے پر گئے تو انہوں نے شیراز سے مجھے ایک منظر کارڈ (VIEW CARD) اس عبارت کے ساتھ روانہ کیا:

شیراز

۱۳ر اکتوبر

عزیزی سرفراز اور اقبال اینڈ کو

پیار

غالباً اس کارڈ سے پہلے ہم خود وہاں پہنچ جائیں گے۔ یہ محض اس ثبوت کے لئے لکھ رہے ہیں کہ ہم آپ لوگوں کی یاد سے غافل نہیں ہیں۔

فقط

فیض

ان ہی دنوں فیض صاحب کا مشرقِ بعید کا پروگرام بن گیا۔ وہ جانے سے پہلے مل نہیں سکے تھے جس کا مجھے ذاتی طور پر افسوس تھا۔ میں سوچتی تھی کہ معلوم نہیں فیض صاحب نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہے یا نہیں؟ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب بنکاک سے انہوں نے ایک ویو کارڈ (VIEW CARD) روانہ کیا اور لکھا:

بنکاک

عزیزی سرفراز اینڈ فیملی

تمہیں منیلا سے ایک کارڈ لکھا تھا لیکن یاد نہیں رہا کہ ڈاک میں ڈالا یا نہیں۔

لکھا یہ تھا کہ آتی دفعہ جلدی میں آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہوسکی، غالباً واپسی پر ہوگی۔ منیلا، ہانگ کانگ گھوم آتے ہیں۔ کل سنگاپور اور کوالالمپور جانا ہے۔ پھر واپسی۔ کام کی مجبوری ہے ورنہ اب ہمارا دل نہیں لگتا۔

پیار

فقط

فیض

اُنہوں نے منیلا سے جو کارڈ روانہ کیا تھا وہ مجھے بعد میں ملا۔ اُنہوں نے حسبِ عادت ویو کارڈ (VIEW CARD) پر جلدی جلدی چند سطریں سپُردِ قلم کردی تھیں لیکن ان چند سطروں میں بھی ان کی محبّت اور توجہ کا بھرپور عکس موجود تھا۔ یہ تحریر کچھ یوں تھی:

منیلا

عزیزی سرفراز اینڈ کمپنی

عید مبارک

افسوس ہے کہ آتی بار تم لوگوں سے مل کر نہ آسکے لیکن حسب معمول چند گھنٹے پہلے اطلاع ہوئی کہ جانا ہے۔ خیر واپسی پر سہی۔ یہ کافی خوبصورت ملک ہے اور لڑکیاں تو بہت ہی حسین ہیں۔ خاص طور سے یہاں کی ملکہ جنہوں نے آج دستِ خاص سے چائے پلائی۔

فقط

فیض

واپسی پر فیض صاحب نے اس سفر کے خوب قصّے سُنائے۔ وہ ان ملکوں کے قدرتی حسُن سے بڑے متاثر دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فلپائن کی ملکہ اسیڈا مارکوس نے ملاقات کے دوران خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر انہیں پیش کی اور رخصت ہونے لگے تو اُس نے ایک سونے کا لاکٹ نما میڈل انہیں بطور یادگار پیش کیا۔ فیض صاحب یہ تمغہ اپنے ہمراہ لے کر جب واپس وطن پہنچے تو کراچی ایئرپورٹ پر کسٹمز کے عملہ نے یہ میڈل برآمد کرلیا

اور بتایا کہ یہ تو خالص سونے کا میڈل ہے۔ آپ کیسے لے آئے ؟ اس پر فیض صاحب نے جواب دیا: بھئی ہمیں تو کچھ خبر نہیں، ہم تو یہی سمجھے تھے کہ عام میڈلز کی طرح کا ایک میڈل ہو گا۔ اگر تم لوگوں کو اعتراض ہے تو تم رکھ لو ہمیں اس کی آرزو نہیں ۔ یہ جواب سُن کر کسٹم کا عملہ ششدر رہ گیا اور انہوں نے وہ میڈل فیض صاحب کو واپس کر دیا۔

فیض صاحب کچھ عرصہ کے بعد ماسکو گئے۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے کہ فوراً خط لکھیں گے مگر اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے بھی انہیں خط نہ لکھا۔ البتہ میرے بیٹے ڈیمی (ندیم) نے انہیں خط لکھا جس میں اُس نے میرے حوالے سے فیض صاحب کی بے وفائی کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے بڑی محبت سے وہاں سے خط لکھا:

ماسکو

۱۰ر دسمبر

عزیزی ڈیمی، پیار

دیکھو اس بار ہم صرف تمہیں کارڈ بھیج رہے ہیں۔ اس لئے پچھلا حساب صاف۔ ہمیں یہاں سے تین دن کے بعد تاجکستان لے گئے تھے۔ وہاں سے کل رات لوٹے ہیں۔ آج روانہ ہونا تھا لیکن جہاز ہی نہیں ملا۔ اب سترہ یا چودہ کو آئیں گے ہر طرف برف ہی برف ہے لیکن منظر بھلا لگتا ہے۔ سب کو میری طرف سے پیار کر لینا اور امی سے کہہ دینا یہ بے وفائی نہیں دنیا داری ہے۔

فیضؔ

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فیض صاحب کو برفباری کا منظر کس قدر بھلا محسوس ہوتا تھا اور اس کو کتنا پسند کرتے تھے۔

سوویت یونین جانے کا اتفاق فیض صاحب کو عموماً ہوتا رہتا تھا۔ ان کی ہمہ پہلو شخصیت کی یوں تو ساری دُنیا ہی میں پذیرائی ہوتی تھی مگر سوویت یونین کو اس ضمن میں خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں کی قیادت سے فیض صاحب کے ذاتی سطح پر تعلقات

استوار تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی اس حیثیت سے کبھی کوئی مفاد حاصل نہیں کیا۔ وہ ایسا سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک فقیری تھی مگر اس میں انداز شاہی کے تھے۔

وہ مئی ۱۹۷۴ء میں ماسکو گئے تو وہاں سے انہوں نے ایک ویو کارڈ (VIEW CARD) مجھے بھیجا اس پر لکھا تھا:

ماسکو

۴ر مئی

پیاری سرفراز اور کمپنی

دوسری طرف ہمارا ہوٹل ہے جس میں کوئی دس ہزار کمرے ہیں۔ پورا محلہ ہے منظر بہت اچھا ہے لیکن سردی ابھی تک بہت ہے۔ آج تو برف بھی گری تھی۔ امید ہے دس بارہ دن تک واپسی ہوگی۔ سب کو بہت سا پیار۔

فیض

اس ویو کارڈ پر واقعی اس ہوٹل کی تصویر تھی جس میں فیض صاحب ٹھہرے ہوتے تھے۔ یہ ایک شاندار ہوٹل دکھائی دیتا تھا تصویر سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ماحول کی صفائی پر بطور خاص توجہ دی جاتی ہے۔

فیض صاحب کے اس بار ماسکو جانے کا ایک مقصد طبی معائنہ بھی تھا چنانچہ انہوں نے مجھے ۲۳ر جولائی کو جو خط روانہ کیا اس میں لکھا:

ماسکو

۲۳/۷

عزیزی سرفراز اقبال اور کمپنی

ہم پرسوں رات دیر سے یہاں پہنچے تھے۔ آج ڈاکٹروں کے نرغے میں رہے۔ کل پھر

باقی ڈاکٹر ٹھونک بجا کر دیکھیں گے۔ اس کے بعد دیکھیں کیا کرتے ہیں۔ موسم اچھا ہے اور شہر بھی ——! پیار

فیضؔ

ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں فیض صاحب سے باقاعدہ علاج کرانے کے لئے کہا تھا۔ وہ خود تو ممکن ہے کسی نہ کسی طرح وہاں سے چل دیتے مگر ان کے دوستوں نے اصرار کیا کہ اب آئے ہیں تو علاج بھی کرالیں۔ محض معائنہ اور چیک اپ سے تو صحت کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ فیض صاحب کے اندر کا شاعر پارہ صفت اور سیلانی تھا لیکن اب کی بار وہ ہمیشہ کی طرح دوستوں کو غچّہ نہ دے سکے۔ چنانچہ انہیں کریملین ہسپتال میں علاج کے لئے داخل کرادیا گیا۔ اس ہسپتال سے انہوں نے ۲ اگست کو مجھے اطلاع دی:

کریملین ہسپتال

ماسکو

۲ اگست

پیاری سرفراز اور اقبال اور قوم

ہم کوئی دو ہفتے سے ہسپتال میں ہیں۔ آج غالباً چھٹی ہوجائے گی۔ پھر شاید دو ہفتے کے لئے کسی سینی ٹوریم میں جانا ہوگا۔ بقول پطرس مرحوم یہاں صرف (CEASARIAN) آپریشن کی کسر رہ گئی ہے۔ باقی سب کچھ ہمارے ساتھ کر چکے ہیں اور کہتے ہیں سب ٹھیک ہے۔ اب آنے میں ذرا تاخیر ہوجائے گی۔ غالباً ستمبر کے پہلے ہفتہ میں آنا ہوگا۔

فقط

فیضؔ

فیض صاحب جہاں جاتے وہاں کے موسم کا حال ضرور تحریر کرتے۔ وہ ویسے بھی موسم کا بہت خیال رکھتے تھے۔ موسم کی تبدیلی کا یقیناً ان کی طبیعت پر بھی بڑا گہرا اثر ہوتا۔

ایک اور بات میں نے بڑی شدت سے محسوس کی کہ وہ عموماً پاکستان سے باہر جاکر بہت زیادہ خوش نہیں رہتے تھے۔ ان کے دل میں اپنے وطن کی محبّت بڑی گہری اور سچی تھی۔ ۱۹۷۶ء ہی میں سرکاری دورے پر ایران گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک ویو کارڈ (VIEW CARD) روانہ کیا اور لکھا:

۲۴ر فروری

پیاری سرفراز اینڈ کو

کل یہاں پہنچے تھے۔ موسم اچھا ہے۔ شہر بھی بُرا نہیں لیکن دن بھر کانفرنس اور شام کو سرکاری دعوتوں کے علاوہ دلچسپی کا کوئی اور سامان موجود نہیں۔ اس لئے کوئی خاص لطف نہیں آئے گا۔ غالباً ۲۸ر تک واپسی ہوگی۔ پیار

فیضؔ

فیض صاحب واپس آئے لیکن چند دنوں کے بعد ہی وہ ایتھوپیا روانہ ہو گئے۔ جہاں سے انہوں نے ۱۷ر مارچ کو ادیس ابابا سے لکھا:

پیاری سرفراز اور بچو!

یہ ملک دیکھنے کی بڑی آرزو تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ کل ماسکو روانگی ہے۔ ایلس بھی وہاں پہنچ گئی ہیں۔ اس لئے وہاں کچھ دن قیام رہے گا۔ وہاں کا پتہ یہ ہے:

C/O

M. SALGANIK

SOVIET WRITERS UNION

VOROVSY ST.

MOSCOW.

ان ہی دنوں ابن انشاء کا ایک خط لندن سے آیا جس میں انہوں نے فیض کے دورے پر بڑی دلچسپ باتیں اپنے مخصوص انداز میں سپردِ قلم کیں۔ یہاں اس خط کا ذکر تو تشنہ رہے گا لہٰذا یہ خط من وعن پیش ہے :

۱۹-۸-۷۶

کیوں بھائی، تم لوگ ہمیں بھول گئے۔

بالکل بھول گئے، بے مہر نکلے، بے وفا نکلے۔ فیض صاحب کے واپس آجانے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ، چاند اپنی جگہ، چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے۔ بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لئے تارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے، چاند بھی ایک ہے، اسے کوئی کہاں تک گنے گا۔

پاکستان میں گرمی ہے۔ موسم کی بھی، سیاست کی بھی، روزے بھی ہیں۔ یہاں موسم خوشگوار ہے، سازگار ہے اور ٹھنڈا ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے اور اپنی پسند کا آرام ہے۔ پھر بھی دل مضطرب اور بے کل رہتا ہے اور کچھ لکھنے لکھانے کا INCENTIVE نظر نہیں آتا۔ ہمارے پاکستان آنے تک ہمارے چند پڑھنے والے ہمیں فراموش کر چکے ہوں گے۔ خیر ہم ان کو فراموش کر دیں گے۔ ویسے کون سا ہم کو ان سے دودھ ملتا ہے۔ فنون مجھے تو ملا نہیں۔ نہ اسے پڑھنے، دیکھنے اور اس نظم کا سامنا کرنے کی خواہش ہے لیکن پاکستان سے کئی لوگوں کے خط آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں کراچی میں باسٹھ سال کے۔ شاعر ہیں، کنور اعظم خان خسروی۔ انہوں نے بھی بقیہ سالوں کی پیش کش کی ہے۔ نہیں معلوم کہ بکنگ بند ہو چکی ہے۔ نورالحسن جعفری نے بھی بڑھ کر بڑے دلاسے اور اضطراب کا خط لکھا تھا۔ بس یہ وقت وقت کا

جذبہ ہوتا ہے۔ اس لمحے کا تصوّر کر کے ہول آتا ہے جب یہ لکھی تھی۔

میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ اس میں ڈیمی[1] کے نام علیحدہ خط بھی تھا کہیں اس کے کچھ اور معنی تو نہیں نکالے، اخبار میں دیکھا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے کوئی کتاب فیض پر لکھی ہے۔ وہ کتاب مجھے بھجواؤ۔ تم بھجواؤ کہ فیض صاحب بھجوائیں یا ڈاکٹر ایوب مرزا بھجوائیں۔ خود فیض صاحب کا ارادہ لوٹ کر آنے کا تھا۔ یعنی وہ تو حضرتِ داغ ہیں، جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔

تین صفحے ہو گئے۔ اب آگے تمہارا خط آنے پر۔ شہاب صاحب بھی کابل سے اسلام آباد واپس آ گئے ہوں گے۔ ان کا ارادہ غالباً اکتوبر میں آنے کا ہے پھر مزے رہیں گے۔ اس دورِ الفت میں دیکھنا اپنا ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا۔ یہ ہر قسم کی چوری پر کاٹا جا سکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہئیں۔ کوشش کریں گے کہ کوئی بہانہ کر کے سال کے آخر میں ایک چکر پاکستان کا لگائیں۔ لیکن اب کے ہمیں انٹرکانٹی نینٹل میں کون ٹھہرائے گا اور لوجوہ اس کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مفتی سے بات ہوئی ہے؟ درجہ بدرجہ سب کو سلام

اور حصہ رسدی سب کو پیار

صحت کی فکر نہ کرو، ٹھیک جا رہی ہے۔

ابن انشاء

اقبال صاحب تو رو رو کے رکھ رکھ کر ہلکان ہو رہے ہوں گے تم؟۔ ہماری عیدی؟

ادھر فیض صاحب نے مجھے نیروبی سے ایک ویو کارڈ (VIEW CARD) ارسال کیا جس پر دریائی گینڈے کی تصویر چھپی تھی اس پر لکھی عبارت اس اعتبار سے بڑی قابل غور ہے کہ اس میں فیض صاحب کے اندر چھپا ہوا ایک مزاح نگار صاف طور پر

---

[1] میرا چھوٹا بیٹا ندیم۔

دکھائی دیتا ہے۔ اُنہوں نے لکھا:

HOTEL NEW STANLEY

KIMATHI STREET

NAIROBI

28/10

عزیزی سرفراز اینڈ کو

ہم یہاں خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ خوبصورت جگہ ہے اور موسم بھی بہت اچھا ہے۔ یہاں کافی دن رُکنا ہو گا اس لئے تم اگر چاہو تو اپنی لکھ بھیجنا۔ اس تصویر جیسی کوئی چھوٹی موٹی چیز چاہیئے ہو تو لیتے آئیں۔ ویسے ہاتھی، زیبرا وغیرہ بھی دستیاب ہیں۔

پیار

فیض

خط کی عبارت کا ایک ایک لفظ صاف بتا رہا ہے کہ فیض صاحب واقعی وہاں خوش تھے۔ انہوں نے جس شگفتگی اور برجستگی کا اظہار کیا تھا اس سے یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ وہاں ان کو من پسند ماحول میسّر تھا یعنی رسمی سرکاری مصروفیات نے ان کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ابن انشاء کا ایک اور خط لاہور سے موصول ہوا جس میں فیض صاحب سے متعلق حسبِ عادت اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ وہ خط یہ تھا:

۶ نومبر ۱۹۷۶ء

سرفراز بیگم۔ آداب

اُمید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے اور آپ کی شہرت کا ستارہ آسمان کی طرف رواں دواں ہو گا۔ میں نے امروز کے کئی کٹنگ نیروبی بھی بھیجے ہیں تاکہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ مجھے خود فخر ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں بلکہ اب تو میرا تعارف اس حیثیت

سے کرایا جاتا ہے کہ ان سے ملو، یہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ یہ بیگم سرفراز اقبال کے جاننے والے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب اس شخص کا نام فیض، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی وغیرہ کی فہرست میں آتا ہے تو یہ بھی کچھ تو ہوگا۔ ایسے ویسے کو تو بیگم اقبال مُنہ لگانے سے رہیں۔ میں آپ کا FAN ہوں۔ آپ کی تصویریں کاٹ کاٹ کر رکھے جا رہا ہوں۔ اب آپ مجھے اپنا آٹو گراف عنایت کریں۔ آٹو گراف سے مطلب دستخط ہے۔ یہ نہ سمجھیں میں کوئی ایسی چیز مانگ رہا ہوں جو آپ کو زرِ کثیر خرچ کر کے دینی پڑے۔

العبد

ابنِ انشاء

کسی کی شہرت سے جلنا ایک قدرتی امر ہے۔ امید ہے آپ مجھے اس کمزوری پر معاف فرمائیں گی۔

وہ دن کچھ اتنے اُداس اور چپ چاپ سے تھے کہ درختوں سے گرتے ہوئے پتّوں نے بھی آواز دینا چھوڑ دی تھی۔ بس یونہی گرتے جاتے تھے چُپ چاپ۔ میرا جی چاہتا کہ لمبی سڑک پر تنہا ڈرائیونگ کرتی جاؤں لیکن سڑک ایسی ہو جس کے دونوں طرف پُرسکون دریا ہوں۔ یا پھر میں ایسے پارک میں بیٹھی رہوں جس کے باہر تو TULIP کے پھُول سجے ہوں مگر اندر سے یوکلپٹس کے درختوں کے لمبے لمبے سائے مجھے دیکھ رہے ہوں اور میں ان کو دیکھ رہی ہوں۔ یا پھر رات کے پچھلے پہر اُٹھ کر ناصر کاظمی کی غزلیں پڑھنا شروع کر دوں۔

ایسے میں ابنِ انشاء کا ایک اور خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا:

۱۳/۱۱/۷۶

محترمہ بیگم صاحبہ

آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ اصل میں آپ کی FAN MAIL بہت

ہو گی اور FAN VISITS تو کیا کہنا؟ کل مجھے بہت بخار تھا اس لئے دفتر نہ آیا۔ اقبال صاحب میری غیر موجودگی میں آئے اور رقعہ چھوڑ گئے۔ آج صبح وہ کوئٹہ روانہ ہو گئے ہوں گے۔

تشخیص کا نتیجہ وہی نکلا جس کا خطرہ تھا۔ HODGKINS DISEASE اب علاج کی فکر ہو ئی ہے۔ جو ہو سو ہو۔ دوا کے ساتھ دعا۔

میں نے نیروبی خط لکھا تھا تو فیض صاحب کے لئے پیغام بھیجا تھا کہ وہاں کی حسیناؤں کے ذریعے افرو ایشین یک جہتی کے لئے کام کریں۔ وہاں سکھنیاں بھی ہوتی ہیں ان کو مشرف بہ اسلام کرنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ شہاب صاحب کا جواب آیا ہے اس میں لکھا ہے:

"فیض صاحب کو آپ کے خط کا صفحہ جو ان کے متعلق تھا، پڑھوا دیا ہے۔ بہت ہنسے اور سرفراز اقبال کے ساتھ تصویر والا تراشہ بڑے خلوص سے جیب میں ڈال لیا یہاں پر فیض صاحب کی مانگ خوب ہے۔ ان کی وجہ سے ہماری بھی خاطر مدارات ہو جاتی ہے۔"

ابن انشاء

محترمہ ثمینہ یاسمین[1] کے مضامین بھی میری نظر سے گزرتے ہیں۔ بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔

ابن انشاء نے فیض صاحب کے حوالے سے جس تصویر کا ذکر کیا وہ تصویر اس کتاب کے شروع میں ہے جس میں فیض صاحب اور میرے علاوہ عصمت چغتائی بھی ہیں۔

---

[1] میری چھوٹی بیٹی۔

یونہی وقت گزرتا رہا۔ دوستوں کے درمیان تو یوں بھی وقت بڑا مہربان اور خوبصورت ہو جاتا ہے بیں کبھی کبھار سوچتی ہوں تو یہ وقت مجھے ساحلِ سمندر کی سنہری ریت کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ ہوا لہروں کے دوش پر تیرتی ہوتی آتی ہے اور انتہائی دلکش نقوش اور لہرئیے بنا جاتی ہے لیکن ہوا اور لہروں کو کیا معلوم کہ کون سی آنکھ ان نقوش کو دیکھ کر بھر آئے گی اور کون سی آنکھ میں یہ خوشیوں کا گمان بن کر اتر جائے گی۔ بہرحال فیض صاحب کا خط ملا جس میں ابن انشاء کی باتوں کی جھلک اور مفہوم کی اداس پرچھائیں صاف نظر آرہی تھی۔

۹/۱۱

عزیزی سرفراز

بھئی تم سے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کل شہاب صاحب نے ابن انشاء کے خط کے ساتھ اخبار لا کر دیا جس میں تمہاری بہت خوبصورت تصویر چھپی ہے۔ لکھنے والے کا نام پڑھ کر ڈاکٹر کی تم سے اور بھی پکی لڑائی ہو جائے گی۔ یہاں دن رات بہت مصروفیت میں گزر رہے ہیں۔ خیال تھا یہاں کسی سے جان پہچان نہیں ہے، لیکن میزبانوں کا ایسا تانتا لگا ہوا ہے، ہم اگلے ہفتے تک BOOKED ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ تمہاری ایک فرمائش تو معلوم ہے۔ کچھ اور بھی چاہیئے تو لکھ دو۔

فیض

میری یہ فرمائش ساڑھی کی تھی جو فیض صاحب واقعی واپسی پر میرے لئے لائے تھے۔ اس کے بعد ابن انشاء کا خط آیا جس میں اس نے مجھے خط نہ لکھنے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز میں دوستانہ باتیں کیں:

۱۴ اپریل ۱۹۷۷ء

سرفراز بیگم ___ ہم نے خط لکھا تھا، تم نے جواب نہیں دیا۔ "اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا۔"

خیر ہم نے انتقاماً تمہارے آدمی کو یرغمال رکھ چھوڑا ہے۔ جب تک تمہارا خط نہیں آتا فیض صاحب کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔

اچھا سُنو، یکم اپریل کو تو ہم نے آپریشن نہیں کرایا تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بیوقوف ہے، اپریل فول ہے۔ اب ۱۹ اپریل کو وہی آپریشن ہو گا۔ ۱۷ کو ہسپتال میں داخل ہوں گا۔ ہماری جان اور ذات تمہیں عزیز ہو تو ہمارے لئے دعا کرو۔

آج شہاب صاحب کا خط آیا۔ معلوم ہوا تم نے کوئی ضیافت کی تھی مفتی صاحب اس میں آئے اور چہکے۔ صادقین بھی تھے۔ دیکھئے ہم کب اس دیار میں ہوتے ہیں۔ اور اس دوار پر آتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو اسی سال کسی نہ کسی بہانے۔ خدا ہمارے ملک کو خیر خیریت سے رکھے۔

اب خط لکھو، وہی سفارت خانہ کی معرفت، بھُول گئی ہو تو پتہ شہاب صاحب سے لے لو۔ ہم نے میناؔ[1] کی کامیابی کی مبارکباد دی تھی، تم بھی پی گئیں، میناؔ بھی۔ بھئی تم لوگ فیض نہیں ہو اور مبارکباد شراب نہیں تھی۔ کیوں پی گئیں؟

ا۔ ا

اور پھر ورق کے دوسری طرف لکھا: کیا فنون کا پرچہ آگیا جس میں وہ نظم[2] آئی تھی۔ مجھے اس نظم سے خوف آتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں فیض صاحب اپنی فلم "دُور ہے سکھ کا گاؤں" کی پروسیسنگ کے سلسلہ میں لندن چلے گئے۔ اُنہوں نے اس فلم کے ڈائیلاگ لکھے تھے۔ اگرچہ یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی لیکن جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ فیض صاحب کی تخلیقی توانائیوں کی کیا کیا جہتیں اور سمتیں تھیں۔ میں نے بھی یہ فلم دیکھی ہے اور میں نے اس فلم کو محض اس لئے (بڑی کوشش کے بعد) دیکھا تھا کہ اس کے مکالمے فیض صاحب

---

[1] میری بیٹی [2] ابن انشا کی مشہور نظم: جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

نے لکھے ہیں۔

لندن سے فیض صاحب نے مجھے لکھا:

32 CHURCH CRES

18/5

پیاری سرفراز اور بچو

یہاں پہنچ کر پچھلے مہینہ تمہیں ایک کارڈ اور ماٹو کے کاغذات کی نقل بھجوائی تھی۔ دونوں کی رسید نہیں آئی۔ نہ جانے تمہیں ملے کہ نہیں۔ گھر کی خبروں کی وجہ سے سب دن بہت پریشانی میں گزرے اور ابھی تک روز نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہاں کا کام بھی شیطان کی آنت ہو گیا ہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ شاید اس ماہ کے آخر تک چھٹی مل سکے۔

آپ لوگ کیسے ہیں۔ اگر یہ خط جلد مل جائے تو خیریت کے دو حرف لکھ دینا۔

سب کو پیار

فیضؔ

لندن سے فیض صاحب نے میرے بیٹے ڈیمی (ندیم) کو خط لکھا۔ میں نے فیض صاحب کو ان کے پہلے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کیوں نہیں دیا تھا؟ اس کی خبر مجھے نہ اُس وقت تھی نہ اب ہے۔ فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لئے اس سنگِ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزرتے ہیں۔ میں فیض صاحب کو بہت طویل اور مفصل خط تحریر کرنا چاہتی تھی مگر ایسا نہیں کر سکی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ طویل خط فیض کے سامنے بیٹھ کر لکھوں۔ وہ سگریٹ پھونکتے رہیں اور میں انہیں خط لکھتی رہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ تو ایک طرح کا پاگل پن ہے مگر مجھے ایسے ہی لگتا تھا۔ ممکن ہے میرے ایسے جذبات کا سبب فیض صاحب کی لندن میں موجودگی ہو لیکن محض اس بات کو جواز

---

¹ میری بیٹی غزالہ شاہین

قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے تب ایک بار سوچا: فیض صاحب کو خط کی بجائے ایک کیسٹ روانہ کر دوں جس میں باتیں ریکارڈ ہوں۔ لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ اگر فیض صاحب نے اسے سُنا ہی نہ تو . . . . !

ان ہی دنوں میں فیض صاحب نے میرے بجائے میرے بیٹے دیمی (ندیم) کو یہ خط لکھا:

لندن

پیارے دیمی

کل پرسوں تمہارا خط ملا۔ تمہاری امی وغیرہ ہمیں یاد کریں تو ہم خاص FLATTER نہیں ہوتے۔ وہ تو برابر کا دوستانہ ہے لیکن اگر تم نے یاد کیا تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ اور ابھی گھر لوٹنے کو تو ہم خود بہت بے چین ہیں لیکن یہاں کے لوگوں نے ہمیں جس کام[1] میں گرفتار کر رکھا ہے وہ ان کی غفلت کی وجہ سے ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ کچھ دن گاڑی چلتی ہے تو وہاں سے پیسے آنے بند ہو جاتے ہیں اور کام رُک جاتا ہے۔ بہر صورت آج ہم نے لکھ دیا ہے کہ اب ہم اور نہیں ٹھہریں گے۔ چھ تاریخ کو یہاں سے بلغاریہ روانگی ہے۔ وہاں تین چار دن کا کام ہے۔ وہاں سے واپسی پر بارہ تیرہ جون کو یہاں سے گھر کی راہ لیں گے اور راستے میں تمہیں دیکھتے جائیں گے۔

یہاں اب جا کر موسم کچھ خوشگوار ہوا ہے اور ہمارے فروری مارچ جیسی کیفیت ہے۔ سب مخلوق کو ملکہ کی جوبلی کا بخار چڑھ رہا ہے۔ ویسے تو ہم بھی M.B.E کی حیثیت میں ملکہ کی گارڈن پارٹی میں جا سکتے ہیں لیکن ہمیں جنابہ کی صورت کوئی ایسی پسند نہیں۔ امی کے خط بھی مل گئے ہیں تم جواب میں ہماری طرف سے پیار کر لینا (اور باقی سب کو بھی) اگر کسی کی کوئی فرمائش ہے تو ابھی سے لکھ دو۔ ہم صوفیہ سے واپسی پر لیتے آئیں گے۔ باقی ملاقات پر۔

فیض

---

[1] وہی فلم "دُور ہے سکھ کا گاؤں" کا کام

اس خط سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیض صاحب کس قدر درویش صفت اور وطن پرست تھے۔ انہوں نے برطانیہ کا ایک ممتاز فوجی اعزاز رکھنے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا اس طرف دھیان بھی نہیں گیا۔ فیض صاحب کے خط میں تاخیر ہوئی تو میں نے ابن انشاء کو لکھا۔ چنانچہ اُس نے جواب میں لکھا:

لندن

۹ جون ۱۹۷۷ء

اے بی بی سرفراز —— تمہارا دوسرا خط بھی ملا۔ ہم خود تو ابھی نحیف و نزار ہیں لیکن نفسِ مضمون ضرور رونما ہوا۔ اسی خط میں شرارتی بھوت دیمی[1] کا خط بھی تھا اس نے تمہارا (اور ہمارا) تعارف جن الفاظ میں کرایا ہے اس سے جی تو بے شک خوش ہوا۔ تاہم اس برخوردار کی تھوڑی سی گوشمالی بھی ضروری ہے۔ ایسی باتیں جو بے بنیاد ہوں یا نہ ہوں —— نہیں لکھا کرتے۔ ع چُپ کر دڑ وٹ جا

معلوم ہوا کہ مینا[2] کا میٹر چلنا شروع ہو گیا ہے۔ اتنے پیسوں کا وہ کیا کرے گی۔ اس سے کہو کہ ہمارے نام سے اسلام آباد میں حساب کھول دے۔ ہم بے لوث خدمت کے قائل نہیں ہیں۔ خدمت کے ساتھ کچھ نہ کچھ لوث ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ بے لوث تو محبت تک بے کار ہوتی ہے۔ ہم کوئی مجنوں کی طرح بیوقوف ہیں۔ وہ تو پہلے سے P.H.D ہے۔ مزید علم حاصل کر کے کیا کرے گی۔ اس بیچارے پر ترس آتا ہے جس کے گلے بندھے گی۔ کیسے سنبھالے گا اس چیز کو۔ شاید وہی نسخہ استعمال کرنا پڑے گا: DARLING YOU CAN LOVE TEN BUT NOT ELEVEN۔ البتہ آخر میں گنتی بڑھانی پڑے گی۔ 'فنون' کے لئے قاسمی صاحب کو لکھ دیا ہے۔ "انشا جی اٹھو" والی غزل

---

[1] میرا بیٹا ندیم [2] میری بیٹی

ہیں سُننے کا روادار نہیں۔ ان چیزوں نے تو ہماری جان لے لی تھی۔ ویسے وہ جو میں ایک دن کے لئے اسلام آباد آیا اور انٹر کانٹی نینینٹل میں ٹھہرا، اس سے تقویت ملی۔ جینے کا حوصلہ ہوا۔ "MANY HAPPY RETURNS" یہ دعا ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ دیمی کراچی جا رہا ہے۔ ڈاکٹر بنے گا۔ جانے کتنوں کو مارے گا۔ قتل کرے گا۔ (اپنی شکل، عقل سے) اور کتنوں کو بچائے گا دوا دارو سے۔ افسوس اتنے اچھے لڑکے کو ادیب اور فنکار بنانے کی بجائے ڈاکٹر بنا رہی ہو۔

فیض صاحب بہت دنوں سے نہیں ملے۔ کیا احمد فراز کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا، ٹھیک ہے؟ یہاں اس کی کوئی خبر نہیں۔ اب تو سارے چھوٹ رہے ہیں۔ پنڈی کی گرمی کا، بلکہ پورے پاکستان کی گرمی کا سنتا ہوں تو دل تراہ، تراہ کرتا ہے۔ یہاں ابھی دو کمبل اور انگیٹھی کا موسم ہے۔ اگر روز نہیں تو ذرا سے چھینٹے پڑنے پر خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن کیا فائدہ جب تک بُکل میں کوئی چور نہ ہو۔ مفتی جی سے کہیئے کہ پہاڑوں پر زیادہ نہ جائیں ورنہ خود پتھر ہو جائیں گے یا قلفی جم جائے گی۔

سُنا ہے ملک کے حالات ٹھیک ہو رہے ہیں، ودھائی۔ اگر کوئی اچھا حل تو لد ہو جائے تو ہمیں لڈو بھیجنا اتنے کہ ٹمک نہ سکیں۔

شہاب صاحب کو پکڑو اور ان سے زبردستی بات کرو۔ تو اب ہمیں پہنچ جائے گا۔ پنڈی آنے کو جی چاہتا ہے۔ اب کے انٹر کان کا خرچہ کون دے گا۔ اگر اقبال کے جشن صد سالہ پر جو شاید ستمبر میں ہے آنا بھی ہوا تو وہ لاہور میں ہو گا۔ کیا اقبال صاحب پنڈی میں پیدا نہ ہو سکتے تھے؟ خیر پیدا ان کو فیض صاحب کے وطن میں ہونا تھا تو دفن تو پنڈی میں ہو سکتے تھے۔ ان کے اس فعل سے ہمارا بھلا ہو جاتا۔

یہاں میرا گھر ہارلے اسٹریٹ کے بالکل پاس ہے لیکن افسوس کہ لندن کی ہارلے اسٹریٹ ہے نقلی۔

ابن انشاء

ادھر لندن سے فیض صاحب سوویت یونین چلے گئے جہاں وہ ہر سال اپنا طبی معائنہ کرانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے جو (VIEW CARD) روانہ کیا وہ یہ تھا:

ماسکو

۳ر جولائی

پیاری سرفراز اور بچو

ہمیں اب تک لوٹ آنا چاہیئے تھا لیکن کچھ دن پہلے ایلس آگئیں اس لئے اور رکنا پڑا۔ کل ہم دس دن کے لئے سینی ٹوریم جا رہے ہیں اور ۱۲ اگست کو واپسی ہو گی۔ اس کے بعد ملاقات ہو گی۔ پیار اور دعا

فیض

فیض صاحب صحت کے معاملے میں (دوسرے دنیاوی معاملات کی طرح) خاصے بے پروا اور لاتعلق سے تھے۔ جب تک کوئی ان کو اپنے ہمراہ پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتا وہ قابو ہی نہیں آتے تھے۔ خود ڈاکٹر بھی ان کی بڑی محبت سے دیکھ بھال کرتے تھے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ فیض صاحب کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا ہو اور اس نے فیض صاحب سے امتیازی سلوک روا نہ رکھا ہو۔

سوویت یونین میں اب کی بار ان کا طبی معائنہ خاصا تفصیلی ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ ابھی انتظار ختم ہی ہوا تھا کہ ایک دن ان کا ایک اور خط آیا۔ لکھا تھا:

پیاری سرفراز اور کمپنی

ہم آج یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ کچھ دن ہسپتال میں گزاریں اس لئے اب ۲۴، ۲۵ کو واپسی ہو گی۔ امید ہے آپ لوگ خیریت سے ہوں گے۔

پیار۔ فیض

اس خط سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیض صاحب اپنے مداحوں اور چاہنے والوں کا کس قدر خیال کیا کرتے تھے۔ حالانکہ دو تین سطروں میں جب وہ حوال لکھتے تو اس سے میری ذہنی تسلی نہیں ہوتی تھی مگر میرے واسطے یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ یہ دو تین سطریں ایک عظیم شخص کی ہیں۔

ہمیشہ ایسا ہوا کہ فیض صاحب کا خط مجھے اس وقت موصول ہوا جب میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی۔ میرے لئے یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی پیاسا پانی کی تلاش میں سراب کو دیکھے اور قریب پہنچنے پر وہ سراب سچ مچ پانی میں بدل جاتے۔

اسی دوران میں فیضؔ صاحب چند دنوں کے لئے پاکستان آگئے تو ابن انشاء نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے خط لکھا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فیضؔ کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ خط یہ تھا:

لندن

۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

اچھی بیگم صاحبہ، اگر ہم نے خط نہیں لکھا تو کیا ہوا، ہم تو شاعر آدمی ہیں ذرور آدمی یہ نہیں شاعر یہ ہے، کیا آپ کے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ آپ کو محفل آرائی اور دوست نوازی اور دیگر آرائیوں اور نوازیوں سے فرصت نہیں تھی تہ ہم — ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔

عالیؔ[1] صاحب نے بھی آمد و رفت کا بتایا۔ میں نے ان کو آشیرواد دی اور کہا: بڑی خوشی ہوئی بس تمہاری کسر رہ گئی تھی۔ آپ کے رجسٹر میں ایک رعایا یا غلام کا ایک اور

۱۔ جمیل الدین عالیؔ

اضافہ ہوا۔ اللّٰھم زد فزد — یہاں عرب بہت ہیں اس لئے دعا عربی میں دینے کی عادت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی آپ کی اولاد خط لکھ دیتی تھی لیکن وہ بھی تو ماں کی آنکھ دیکھتے ہیں۔

ہمارے فیض صاحب کہاں ہیں، کہیں مکھی بنا کر ڈبیا میں تو نہیں بند کر لیا؟ علامہ اقبال کے جشن میں ہندوستان گئے ہوں گے یا جا رہے ہوں گے۔ نام ہمارا بھی ایک خبر میں شائع ہوا ہے۔ ایک دعوت نامہ بھی اس سلسلہ میں پاکستان سے گھومتا گھامتا یہاں پہنچا تھا لیکن ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ ہم نے تو نومبر میں پاکستان جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا لیکن اسلام آباد ایجوکیشن منسٹری والوں نے ہاں نہ میں جواب ہی نہیں دیا۔ ذرا شہاب صاحب کو فون اور میری طرف سے یاد دہانی کراؤ کہ —— فون کر کے جواب بھجوائیں۔

اور آپ کے سول اینڈ ملٹری دوستوں کا کیا احوال ہے۔ افسوس کہ آپ کا گھر چھوٹا ہے لیکن سامنے کا پلاٹ خالی ہے، وہاں شامیانے لگوا کر ہر روز صبح کو آپ کو اپنا دربار بھی منعقد کرنا چاہیئے اور نذریں وصول کرنی چاہئیں اور خلعت و انعام تقسیم کرنے چاہئیں۔ حد ہے اتنے دنوں سے وہ جگہ خالی ہے اور آپ لوگوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے کچی آبادی نہیں بنایا جو کبھی نہ کبھی تو مستقل ہوتی۔ اتنی مہاجریت تو آنی چاہیئے۔

اب ہمیں کہیں جانا ہے۔ آپ کے دروازے پر بھی کوئی گھنٹی بجا رہا ہوگا، یا زنجیروں کو جھٹکے دے رہا ہوگا۔ بس فی الحال رخصت۔

تاریخ انگلستان پڑھی — ملک کی تو تاریخ کی بجائے اب جغرافیے کی زیادہ فکر کرنی چاہیئے۔ خط فوراً لکھو۔ ٹکٹ منگاؤ۔

ل ل

فیضؔ صاحب کچھ عرصہ کے بعد امریکہ چلے گئے۔ اب کے ان کی منزل جزائر ہوائی تھے۔ وہ ہونولولو پہنچے تو انہوں نے یہ خط لکھا:

ہونولولو

ہوائی

۵ فروری

پیاری سرفراز

بہت زمانے کے بعد تمہارا دوسرا خط یہاں آن کر ملا، کچھ تسکین ہوئی۔ تمہیں ایک خط اور کچھ اشعار پروفیسر سجاد ملک (P.N.C.A) کے ہاتھ دو تین ماہ پہلے بھجوایا تھا۔ نہ جانے وہ خط تمہیں ملا کہ نہیں۔ تمہارے خط کے بعد آج ایک خط اپنے دوست دیمی[1] کا بہاولپور سے آیا ہے۔ اسے بھی لکھ رہا ہوں۔ مینا[2] سے تو خیر اب کُٹی ہو گئی۔ مانو[3] اور غالبؔ[4] سے البتہ کوئی لڑائی نہیں۔ اس لئے کہ وہ اب معتبر لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہاں HAWAi میں اتنی دوستیاں ہو گئی ہیں کہ مانو یہاں آنا چاہے تو ہر وقت ہی بُلا سکتے ہیں۔ لیکن سنا ہے کہ یہاں کی یونیورسٹی

---

[1] میرا بیٹا ندیم [2] میری بیٹی ثمینہ یاسمین [3] میری بیٹی غزالہ شاہین [4] میرا بیٹا غالب۔

ہیں ڈاکٹری کی تعلیم کوئی خاص اچھی نہیں ہے۔ اگرچہ دوسری آسائشیں بہت ہیں۔ ایک آدھ اور یونیورسٹی میں بھی کچھ یاد اللہ ہوگئی ہے۔ وہاں آکر بات کریں گے۔ اپنے سفر کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ اگلے ہفتہ یہاں سے روانگی ہوگی۔ واشنگٹن میں ۷ا تاریخ کو ایک تقریب ہے۔ شاید راستے میں ایک آدھ جگہ رُکنا پڑے لیکن اس ماہ کے آخر میں بہر صورت گھر پہنچ جائیں گے انشاء اللہ۔ تم نے اقبال کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ایران کا تو قصہ پاک ہوگیا اب کہیں اور رُخ کریں۔ پیشتر اس کے کہ وہاں بھی "کُلّ مَن عَلَیھَا فَان" ہو جائے۔ یہاں پر گھر کی خبر اوّل تو آتی نہیں اور کچھ چھپتا بھی ہے تو محض دل جلانے کے لئے۔ خیر "جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا"۔ اور یہ بےچارے جوش نے کسی کا کیا بگاڑا تھا یا ہم نے۔ اگرچہ ہم نے تو فقیروں کی صدا اپنا لی ہے کہ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یعنی جو اچھا ہے اس کا بھی بھلا جو بُرا ہے اُس کا بھی بھلا۔ اپنوں اور پرایوں کی دوستی اور محبت سے اتنا کچھ مل چکا ہے کہ حریفوں کا کیا گلہ کیجئے۔

اللہ کرے کہ اپنے دیس اور لوگوں پر کوئی اور افتاد نہ پڑے۔

بہت سا پیار

فیضؔ

اسی روز انہوں نے میرے بیٹے دیمی (ندیم) کو ایک خوبصورت ویو کارڈ (VIEW CARD) ارسال کیا جس پر نیاگرا آبشار کی تصویر تھی۔ انہوں نے لکھا:

ہونولولو (ہوائی)

۵/۲

پیارے دیمی

یہ کارڈ ہم نیاگرا آبشار سے تو نہیں بھیج رہے ہیں۔ وہ تو بہت پہلے گھوم چکے ہیں۔

یہ جگہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے لیکن تم لاہور کے بجائے بہاولپور کیسے پہنچ گئے۔ تمہاری امی نے سوچا ہو گا کہ لاہور جا کر بہیں نہ ہو جاؤ۔ ان کا خط بھی آیا ہے۔ بس اب دنیا بہت دیکھ لی ہے۔ دو تین ہفتے میں گھر پہنچ جائیں گے تو آپ سب سے ملاقات ہو گی۔ بہت سا پیار۔

فیض

(فیض صاحب نے میرے نام خط میں جوش صاحب کا جو ذکر کیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ ان دنوں ٹی وی پر ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات محمود اعظم فاروقی نے کی تھی۔ چونکہ موصوف کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا لہٰذا بعض مفاد پرست اور موقع شناس شاعروں نے محض وزیر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہاں جوش اور فیض کے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔)

ان دنوں میں نے کئی بار فیض صاحب کو خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک بار خط لکھا بھی مگر اس کو پوسٹ نہ کر سکی۔ معلوم نہیں کیا بات تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک بے نام سی اداسی میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شالامار باغ میں ایک مغل شہزادی چاند کی چودھویں رات میں اپنے شاہانہ لباس میں سنگ مرمر کی روش پہ اکیلی گھوم رہی ہے اور میں اس کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ میں کہیں نہیں۔ بس میری نگاہ باغ میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ مغل شہزادی افسردگی کے ساتھ ہولے ہولے یوں چہل قدمی کر رہی ہے جیسے کچھ دیر بعد فوارے، پھول، محرابیں، طاقچے، مشعلیں، روشنیں — غرض کہ سب کچھ بجھ جائے گا۔ مجھے یوں لگتا جیسے یہ مغل شہزادی دراصل میری رُوح کا ایک حصہ تھا جو روزِ ازل مجھ سے بچھڑ گیا ہو گا۔ تب ہی میرا جی چاہتا کہ میں اس مغل شہزادی کو آواز دوں، اسے پکاروں، اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لوں — لیکن

خواب حقیقت تو نہیں ہوتے۔

مجھے احساس تھا کہ فیض صاحب کو خط نہ لکھ کر میں کوئی خوشگوار رسم ادا نہیں کر رہی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ میں نے انہیں خط لکھنے کا فیصلہ نہ کیا ہو! لیکن کوئی دن ایسا نہ آیا جب اس فیصلے پر عمل ہوا ہو۔ میں بھی خالی ہاتھ رہی، میرے دن بھی تہی دامن مجھے معصومیت سے دیکھتے گزرتے رہے۔ ایک دن فیض صاحب کا خط آیا:

پیاری سرفراز

یہ مزے کی بات ہے کہ تمہیں خط لکھیں تو جواب دیمی کی طرف سے آتا ہے اس لئے ہم بھی یہ خط اسی کے پتے پر بھیج رہے ہیں۔ اُس نے تمہاری اداسی کا لکھا ہے ظاہر ہے کہ پردیس میں صورت حال اور بھی ابتر ہے لیکن مجبوری کے ہاتھوں ہم نے لکھا تھا کہ "یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں" لیکن وہ تو اپنے وطن کے جیل خانے کی بات تھی۔ پتہ چلا کہ پردیس کے چار دن آزادی اور آسائش کے باوجود زیادہ کڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب یہاں بہار کا موسم ہے اور دوست احباب سے ملنے کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں لیکن پھر بھی صبح آنکھ کھُلتی ہے تو روشنی اچھی نہیں لگتی۔ یہی جی چاہتا ہے کہ لیٹے رہیں تصورِ جاناں کیئے ہوئے۔ خیر، یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

ماٹو[1] کی بات کی تفصیل لکھ دو، کب، اور کس سے۔ زیادہ دل اُچاٹ ہوا تو شاید ہم لوٹ ہی آئیں۔ کینیڈا جانا نہیں ہو سکا۔ ہندوستان، امریکہ ہنگری جرمنی چاروں طرف سے دعوتیں ہیں لیکن اوّل تو اب بقول غالب "ہوسِ سیر و تماشا کہ جو کم ہے ہم کو" اور دوسرے دل چاہتا ہے کہ آوارہ گردی کی بجائے ایک جگہ ٹک کر کوئی کام کریں۔ دل سے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ماٹو کی شادی جلد طے ہو گئی تو اسے اکیلے پردیس کیسے بھیج دو گی۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ جا کر اس کا گھر وغیرہ

---

[1] میری بیٹی غزالہ شاہین

ٹھیک کرنے میں ہاتھ بٹاؤ۔ جو کام نہیں آتا ہو ہم سے پوچھ لینا۔

بہت سا پیار

فیضؔ

یہ ایک ایسا خط تھا جس نے میرے دھیان میں چپ چاپ چہل قدمی کرتی ہوئی مغل شہزادی کو چونکا دیا۔ فیض صاحب کی حب الوطنی اور وطن دوستی کی میں تو پہلے ہی سے قائل تھی مگر اس خط کے پڑھنے کے بعد مجھے فیض صاحب پر اُس پرندے کا گمان ہونے لگا جو گہری بے وفا شام میں اپنے گھونسلے کی طرف اُداس اُڑان میں گم ہے۔ بے مہر بادل اس کا راستہ روکتے ہیں لیکن وہ بے پروا بہادری کے ساتھ واپسی کا سفر جاری رکھتا ہے۔

فیض صاحب کے صوفی تبسّم کے ساتھ جو تعلقات تھے اس سے کون واقف نہیں۔ دونوں کی دوستی دراصل ایک دور کا جیتا جاگتا آٹوگراف تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ صوفی تبسّم اچانک سب کو حیرت زدہ کر کے ملک عدم سدھار گئے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ اس قدر بھرپور اور مجلسی انسان تھے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ میرے جی میں آیا کہ فیض کو اس کی اطلاع کر دوں مگر یکدم میں نے ارادہ ترک کر دیا "وہ تو پہلے ہی بہت اداس ہیں" لیکن ظاہر ہے کہ میں خود کو تو روک سکتی تھی، وقت کو روکنا تو میرے بس میں نہیں تھا۔ لمحوں کے راستے میں فیصلوں کی دیوار اُٹھانا ناممکن ہی تو ہے۔ انہیں لندن میں اس کی خبر ہوئی اور اس کا ان پر کس قدر گہرا اثر ہوا اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

لندن

یکم مارچ

پیاری سرفراز اور عزیزاں

تمہیں جلد نہیں لکھ سکے کہ دماغ بہت پراگندہ تھا۔ پہلے صوفی صاحب کا سُن کر دل بیٹھ گیا۔ پھر جس کام[1] سے آئے تھے اس میں کچھ پریشان کن پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

---

[1] کام وہی فلم کی پروسیسنگ۔

جو ابھی تک موجود ہیں۔ اس پر بلا کی سردی۔ غرض بہت عذاب میں دن گزرے۔

اب موسم بہتر ہو چلا ہے اور دل بھی ٹھہر گیا ہے لیکن کام ابھی تک اُلجھا ہوا ہے۔

غالباً کچھ دن اور لگ جائیں گے۔

آپ سب لوگ کیسے ہیں۔ اگر جلدی سے خط لکھ دو تو شاید جانے سے پہلے مجھے مل جائے۔ غالباً ندیم[1] کا داخلہ ہو گیا ہو گا اور مینا[2] کو سی آئی اے سے کوئی خبر آگئی ہو گی۔ آپ کے ہاں تو اب بہار کا موسم ہو گا جسے نہ دیکھ سکنے کا افسوس ہے۔

بہت سا پیار

فیض

وہ یہاں پاکستان کی بہار رُت کو لندن میں بیٹھ کر ترستے تھے اور جب وہ یہاں آئے تو موسم بدل چکے تھے۔ سب کچھ جوں کا توں تھا مگر بہت کچھ بدل بھی گیا تھا۔ اب محسوس ہوتا جیسے لوگ جو باتیں کر رہے ہیں ان کے لفظوں سے معنی جدا ہو گئے ہیں۔ گفتگو ہوتی تو یوں جیسے تھکے ہارے کلرک شام کو گھر کے آنگن میں اپنے پرانے سائیکلوں کو تالا لگا کر کھڑا کر دیں۔ محفلیں ایسی یکسانیت میں ڈوب گئیں جیسے کسی عبادت گاہ میں راہبائیں قطار اندر قطار جلتی شمعوں کے سامنے کھڑی ہوں، چُپ چاپ۔

فیض صاحب نے بہت بوجھل دل سے ایک فیصلہ کیا۔ وطن سے جانے کا فیصلہ۔ میں نے سُنا تو دنگ رہ گئی لیکن میں کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے دل و دماغ پر بدلتے موسموں کا بڑا اثر ہے۔ انہیں لاہور سے روانہ ہونا تھا۔ فیض صاحب تو ایک طرف رہے ہم دوستوں کی بڑی عجیب و غریب ذہنی کیفیت تھی۔ ایک تیز گھٹن کا احساس۔ ایسا حبس کہ لوگ لُو کی دعا مانگنے لگیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں فیض صاحب کو صرف پاکستان کے موسموں اور دوستوں سے جدائی کا ملال تھا۔ وہ بظاہر تو سگریٹ کا

---

[1] میرا بیٹا [2] میری بیٹی ثمینہ یاسمین

دھواں اڑاتے مگر میں صاف طور پر محسوس کرتی تھی کہ ان کی روشن اور عقابی نگاہوں میں دھواں دھواں سائے گزرتے جاتے ہیں۔

فیض صاحب کی روانگی کے دن میں اور میری بیٹی مینا ان کو ڈاکٹر ایوب مرزا کے گھر سے لے کر ائیر پورٹ گئے۔ میں صاف طور پر دیکھ رہی تھی کہ سفید پوش سائے ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔ ان کی مخصوص نظریں مجھے پریشان نہیں حیران ضرور کر رہی تھیں۔ بس ذہن پر اس سوال کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے کہ فیضؔ کا مقدر کیا ہے؟

فیضؔ صاحب نے مجھے کہا: بھئی تم جاؤ ــــ!

کیوں؟

تمہارے شوہر سرکاری ملازم ہیں۔

تو پھر کیا ہوا؟

تم لوگوں کو پریشانی ہوگی۔

میں پریشانی سے گھبرانے والی نہیں۔

بھئی ــــ سمجھا کرو ناں؟

میں سمجھ گئی ــــ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔

ان کی باتوں کے رنگ بالکل ویسے ہی تھے جیسے میں محسوس کرتی تھی۔ ایک وقار اور بانکپن تھا ان کے لہجہ میں ــــ اور میں حیران تھی کہ ہجرتوں کا مسافر اپنے اعتماد کو سفر کی گواہی بناتے ہوئے صرف اور صرف دوستوں کی "پریشانی" کو مدنظر رکھے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کے گھر سے ائیر پورٹ تک کا سفر بڑا عجیب سا تھا مسکرانے لگتی تو آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے اور انہیں صاف کرتی تو فیض صاحب کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ فیضؔ کو الوداع کر کے میں اور مینا اس وقت تک ائیر پورٹ پر موجود رہے جب تک ان کا جہاز فضا میں بلند نہیں ہو گیا۔ جہاز کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا، مجھے اپنا وجود

جہاز کے پیچھے اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس وقت میرا جی چاہا میں بھی ایک پرندہ ہوتی کہ مجھے کہیں دُور سے مینا کی آواز آئی : امی چلیں ــــ اب چلتے ہیں۔

فیض صاحب اسلام آباد سے کراچی گئے اور ایک ہوٹل میں کچھ دیر قیام کر کے بمبئی چلے گئے۔ ہوٹل سے انہوں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گئے۔ بمبئی سے اُنہوں نے مجھے یہ خط لکھا :

بمبئی

۷ اپریل

پیاری سرفراز

ہم کل خیریت سے یہاں پہنچ گئے تھے اور کل دہلی روانگی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بار تمہیں بے وجہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کا تجربہ بھی ہو جانا چاہیئے۔ اور اب کے آپ لوگوں سے فراغت میں ملاقات بھی نہ ہو سکی لیکن محاورے کے بقول "یار زندہ اور صحبت باقی"۔ کہیں ٹھکانہ ہو جائے تو تمہیں پتہ لکھیں گے ــــ فی الحال تو محض گھومنے کا پروگرام ہے۔ سب کو بہت سے پیار۔

فقط
فیض

فیض صاحب لندن چلے گئے جہاں سے انہوں نے مجھے خط لکھا۔ یہ خط اس اعتبار سے بڑا اہم اور یادگار ہے کہ اس میں ان کی "وطن دوستی" بڑی اجاگر ہے۔ انہوں نے جس بوجھل دل سے وطن چھوڑا اس کی جھلک بھی اس خط میں نمایاں ہے۔ یہ خط مجھے جس روز ملا اس دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فیض صاحب مجھے دوبارہ پہلی بار ملے ہیں۔

لندن سے موصول ہونے والا فیض صاحب کا خط اس طرح تھا :

پیاری سرفراز

ہم دو تین روز ہوتے یہاں پہنچے ہیں۔ تمہارا پرانا خط بھی رکھا ہوا مل گیا۔ اس دوران ہندوستان تو رُکنا نہ ہو سکا البتہ تاجکستان اور ازبکستان۔ قزاقستان میں دو تین ہفتے بہت اچھے گزرے۔ خاص طور سے تاجکستان میں جہاں ان کے قومی ادیب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی اور بہت سے ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ ایک آدھ تقریب تو بالکل پاکستان کی نذر ہو گئی یعنی علامہ اقبال کا کلام گایا گیا۔ ہمارے نام ان کے ایک مشہور شاعر کی نظم پڑھی گئی۔ پھر ہماری کچھ چیزوں کا ترجمہ گایا گیا اور آخر میں 'سوہنی دھرتی' — تمہیں یاد ہو گا ان کا طائفہ[1] ہمارے اسلام آباد آنے سے کچھ دن بعد ہمارے ہاں آیا تھا۔ وہی لوگ یہ نغمہ یاد کر کے لے گئے ہیں اور اب یہاں اکثر گایا جاتا ہے۔

یہاں سے اس ماہ کے آخر میں غالباً کینیڈا جانا ہو گا، شاید امریکہ بھی۔ واپسی پر ہندوستان کا دورہ مکمل کریں گے اور اس کے بعد اللہ مالک ہے۔ ویسے تو ہر جگہ مسافر نواز بہت ہیں اور آرام سے گزر رہی ہے لیکن گھر سے ایسی لمبی غیر حاضری سے کبھی کبھی دل دکھتا ہے اور آپ لوگ اکثر یاد آتے ہیں۔ اگر اقبال ایران چلے گئے ہیں اور دیمی لاہور میں ہے تو تم بہت تنہا ہو گی لیکن یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ پنجابی شاعر کے بقول "دل نوں ٹھکانے رکھیئے"۔ ایلس نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی تمہارا ٹیلی فون آتا ہے جس سے وہ بہت خوش ہے۔ اچھی بات تو یہ ہو کہ تم مینا اور مانو کو جلدی سے امریکہ روانہ کر دو بلکہ انہیں ساتھ لے جاؤ۔ راستے میں کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جائے گی۔ ڈاکٹر[2] اور شیریں کو پیار پہنچا دو۔ میں انہیں خود بھی لکھوں گا۔ ایک نظم بھی سن لو:

---

[1] ادارہ ثقافت پاکستان کی دعوت پر آنے والا ایک روسی ثقافتی طائفہ [2] ڈاکٹر ایوب مرزا

"دلِ من، مسافرِ من"

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشناسایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
جو ملا نہ کوئی پُرساں
بہم التفات کرنا
"تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے"
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا

"ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا"

اگرچہ فیض صاحب کی نظم نے سارے ماحول کو بقول ناصر کاظمی 'سائیں سائیں' کر دیا مگر اس کے باوجود اس میں کہیں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور آبشار گرنے کے ترنّم کا احساس ضرور تھا۔ میں نے اس نظم کی فوٹو کاپیاں کرا کے دوستوں میں تقسیم کیں بس میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب کی باتیں لوگ کریں اور میں سنتی رہوں۔ میرے جذبات کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے یہ نظم خالد سعید بٹ کو دیتے ہوئے کہا:

خالد — یہ کاغذ بول نہیں سکتا؟

مجھے یاد ہے خالد نے میری طرف غور سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ یقیناً وہ مجھے "جھلّی" کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ البتہ ہم دونوں کی نگاہیں بیک وقت سامنے پڑی فیض صاحب کی تصویر پر مرکوز ہو گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد میرے بیٹے دیمی نے بتایا کہ اسے بھی فیض صاحب کا ایک خط ملا ہے۔ دراصل اس نے میری اداسی اور ملال کو کم کرنے کے لئے انہیں خط لکھ دیا تھا۔ فیض صاحب نے لکھا:

پیارے دیمی

تمہارا خط ملا، بہت خوشی ہوئی۔ تم نے جو امی کا لکھا ہے اسے پڑھ کر کچھ اداس بھی ہوں لیکن کچھ دل خوش بھی ہوا کہ کوئی ہمیں یاد تو کرتا ہے اور دیکھو تمہارے نمبر کتنے بڑھ گئے ہیں کہ امی کو تمہارے پتے پر لکھ رہے ہیں۔ ان کا خط تو ابھی آیا نہیں۔ مانو کی بات طے ہو گئی تو خوشی ہوئی لیکن ہم شادی پہ کیسے پہنچیں گے خیر وہ یہاں سے گزریں گی تو ہم ان کا ایک اور نکاح پڑھوا لیں گے۔ اپنا پروگرام ابھی تک بہت گڑبڑ ہے۔ ایک ہی وقت مختلف جگہوں سے بلاوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہاں جائیں، کہاں نہ جائیں لیکن یہ مہینہ تو غالباً یہیں گزرے گا۔

اگر تمہارا کالج نہیں کھلتا تو بہتر ہے کہ تم وہیں امی کے ملنے والوں ڈاکٹروں سے پوچھ کر اپنا کورس شروع کر دو، گھر پر ہی سہی۔ مینا بیگم کی افسری کس حال میں ہے، اگر وہ خط لکھنا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

پیار

انکل فیضؔ

ان دونوں خطوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیض کس قدر مزاج آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کون سی بات، کس کے ساتھ اور کیسے کہنا ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ دلآویز انداز تھا جس نے ان کے گرد ایک خوشبودار احترام کا ہالہ سا بُن دیا تھا۔ ہر شخص ان سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا تھا اور وہ چپ چاپ سب کی سنتے رہتے تھے۔

میں نے ان کو ایک خط تحریر کیا جس میں جا بجا اپنی سوچوں کا ذکر تھا۔ اس خط کا مضمون مندر کے اس کونے کی طرح تھا جس پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ حالانکہ اس کونے میں بھی پھولوں کی پتیاں اور گجرے گرے ہوتے ہیں۔

فیض صاحب نے میرے اس خط کے جواب میں نہایت حوصلہ افزا خط لکھا جو یوں تھا:

۱۹ر جون

پیاری سرفراز

تمہارا خط ملا، میرا دوسرا خط بھی تمہیں پہنچ گیا ہو گا۔ جو تم نے لکھا ہے کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے یعنی جہاں تک بدعادتوں کا تعلق ہے۔ تمہاری عادت ہمیں بھی اتنی پڑ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی "ضیا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی" کا مضمون ذہن میں آتا ہے۔ کسی زمانے میں ایک آدھ یاد اللہ یہاں پر تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے چنانچہ لندن سے جی کافی بھر گیا ہے اس لئے اگلے ہفتے چند

دنوں کے لئے پیرس اور فرانس کا ارادہ ہے۔ وہاں سے لوٹ کر کہیں اور کا سوچیں گے لیکن پتہ نہیں کا رہے گا۔ سنا ہے اس سال آپ کے ہاں بہت گرمی پڑی جو شاید عذابِ الٰہی کا اشارہ ہے۔ حالانکہ یہاں والے شدید سردی کو اس کی علامت سمجھتے ہیں۔ اور اس سال جب ہم یہاں پہنچے تو واقعی بہت سردی تھی۔ اب موسم مزاجِ یار کی طرح ہے۔ ایک دن بارش، ایک دن دھوپ، کل لاہور میں چھیمی[1] اور میزو[2] سے بات ہو گئی تھی جس سے تشفی ہوئی۔

مانو[3] کی بات غالباً اب تک طے ہو گئی ہو گی جس سے کچھ تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ مینا[4] تو اپنا انتظام خود ہی کرے گی۔ اقبال کا جانا ہوا کہ نہیں یا اب مانو کو رخصت کر کے جائیں گے۔

تھوڑی بہت تُک بندی ہو جاتی ہے۔ کچھ بھجوا رہا ہوں۔ کچھ پھر بھیج دوں گا۔

بہت سا پیار

فیضؔ

اس عرصہ میں فیض صاحب کچھ دنوں کے لئے پیرس گئے۔ ان کی روانگی کے وقت میرا اور میری بیٹی مینا کا خط انہیں مل چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس حوالے سے میری بیٹی کو جواب دیا:

پیاری مینا

کل لندن سے چلتے وقت تمہارا اور امی کا خط ملا تھا۔ یہ چند حروف تو محض رسید کے لئے ہیں۔ باقی واپس لندن پہنچ کر لکھیں گے۔ یہاں آٹھ دس دن کا پروگرام ہے۔ ۱۰ یا ۱۱ جولائی کو لوٹ جائیں گے۔ تمہاری شرط تو پوری ہو گئی۔ اس لئے ہمیں لندن کے پتے پر لکھ بھیجو۔ سب کو بہت سا پیار۔

انکل

---

[1]، [2] فیض صاحب کی بیٹیاں سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی [3]، [4] میری بیٹیاں غزالہ شاہین ثمینہ یاسمین

یہ خط اس اعتبار سے بڑا اہم ہے کہ اس میں فیض صاحب کی شخصیت کا وہ پہلو اجاگر ہوتا ہے جو وہ بچّوں کے لئے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ وہ بچّوں میں ہوتے تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ بچّوں کی باتیں زیادہ معصوم ہیں یا فیض صاحب کی۔ وہ ایسے مواقع پر بہت مسرور دکھائی دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے میرے بیٹے ڈیمی کو لکھا:

پیارے ڈیمی

چلو بھئی، ہم نے خط نہیں لکھا تھا، کارڈ بھیجا تھا لیکن تم نے اس کی رسید جو نہیں دی، اس لئے تمہاری کوئی شکایت نہیں بنتی۔ اور امی سے تم نے مقابلہ کب سے شروع کیا ہے۔ تم نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی یاد کر کے رو بھی دیتی ہیں لیکن تم نے کتنے آنسو بہائے ہیں ــــ تو پھر؛ البتہ بہاولپور میں تم گھر کی عیاشیوں کو Miss کرکے ضرور کبھی بسورتے ہوگے اور یہ ائیر کنڈیشنر نہ لگنے کی شکایت کیسی۔ وہ کمرہ تمہارا تو نہیں ہمارا ہے۔ تم کو ہم نے اپنے کرائے دار کی حیثیت سے (بستر وغیرہ بنانے کے عوض میں) جگہ دے رکھی ہے۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی دن کہہ دیں کہ یہاں سے اپنا بوریا بستر کہیں اور لے جاؤ۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ تم گھر واپس آ گئے۔ مینا کے جانے کے بعد کچھ تو رونق رہنی چاہیئے۔ اور اب تو بٹّی[1] بھی وہاں نہیں اس لئے دنگا فساد کا بھی خطرہ نہیں۔

ہم ابھی افریقہ کے دو انقلابی ملک دیکھ کر آتے ہیں۔ اب لبنان وغیرہ کا ارادہ ہے۔ پھر شاید تمہاری طرف رُخ کریں۔ تم کمرہ ٹھیک کر کے رکھو۔

پیار

انکل

ڈیمی سے فیض صاحب کو خاص اُنس تھا جیسا کہ اس خط سے بھی ظاہر ہے فیض

---

[1] ڈاکٹر ایوب مرزا کا بیٹا امجد۔

صاحب جب بھی آتے ہمیشہ دیمی ہی کے کمرے میں قیام کرتے۔ دیمی بھی فیض صاحب سے ہی خاصا مانوس تھا۔ دونوں خوب باتیں کیا کرتے۔ اُدھر فیض صاحب نے ایک بار پھر ماسکو کا سفر اختیار کیا۔ ان کی صحت بھی "مزاج یار" جیسی تھی۔ وہ خود اس کی پرواہ ذرا کم ہی کیا کرتے تھے البتہ خوش قسمتی سے ان کے چاہنے والے اس بارے میں خاصے فکرمند اور چوکنا رہتے تھے۔ چنانچہ فیض صاحب کا سفرِ ماسکو اسی باعث اور دوستوں کے اصرار کے نتیجہ میں ہوا تھا۔ وہاں سے انہوں نے دیمی کو ایک اور خط لکھا:

پیارے دیمی

پرانی عید مبارک (یعنی سب لوگوں کو)

پانچ چھ دن پہلے عید سے اگلے روز، ہمیں تمہارا اور تمہاری امی کا خط ملا تھا جس میں تمہاری امی نے لکھا تھا کہ وہ اور مانو عید کے بعد لندن جا رہی ہیں لیکن یہ نہیں لکھا تھا کہ عید کے کتنے دن بعد اور کتنی دیر کے لئے اور کس کام سے۔ اس سے دو ہی دن پہلے ہم بلغاریہ سے ماسکو پہنچے تھے (ہم یعنی یاسر[1] اور ایلس کے ساتھ جو اس سے ایک ہفتہ پہلے ماسکو پہنچے تھے اور آتے ہی ہمارے ساتھ صوفیہ روانہ ہو گئے تھے) اس لئے جلدی میں وہاں سے جواب نہیں لکھ سکے۔ یہ جگہ سمندر کے کنارے ایک صحت افزا مقام ہے جہاں دو تین ہفتے کے لئے ہمیں "صحت بنانے" کے لئے قریب قریب زبردستی بھیجا گیا ہے۔ اٹھارہ یا انیس تاریخ کو ماسکو واپسی ہو گی اور پھر ایلس اور یاسر گھر چلے جائیں گے اور ہم کسی اور طرف بستر باندھنے کی سوچیں گے۔ اگر ان دنوں تک تمہاری امی اور مانو لندن یا انگلستان میں ہوں تو اُدھر کی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلے ان کا پتہ تو چلے۔ یہ خط امی کے بجائے تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر وہ روانہ ہو گئی ہوں تو ان کا پتہ مجھے

---

[1] یاسر فیض کا نواسہ اور سلیمہ ہاشمی کا بیٹا۔

ماسکو میں تار سے بھجوادو اور اگر نہیں گئی ہیں تو ان کا پروگرام بھی ان سے کہیں
کہ کسی طرح جلدی سے بھجوادیں۔ یہاں خط و کتابت کے لیے اتنی مدت درکار ہوتی
ہے کہ جلدی میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن خیر پھر بھی اگر کسی طرح لندن میں ان کا
ساتھ ہو سکے تو اچھا ہو گا اس لئے کہ لندن میں اجنبی لوگوں کو کافی دقت پیش آ
سکتی ہے۔ امی کی اطلاع آجائے تو انہیں بعد میں لکھیں گے۔ مینا کا پتہ کہیں
گم ہو گیا ہے وہ بھی لکھ بھیجو۔ سب کو بہت سا پیار

انکل

یہ بات شاید میں نے پہلے بھی کہی ہے کہ فیض صاحب کا یوں وطن سے چلے جانا
مجھے بہت اداس کر گیا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر سمندر کی ریت کی طرح اداسی کے پانی
میں گھلتی رہتی تھی کہ اتنے بڑے حوصلے اور ظرف کے شخص کو اس مٹی کی جدائی کا دکھ
برداشت کرنا پڑا ہے۔ مجھے کئی بار بچوں نے بھی پوچھا تو میں نے یہ ہی کہا: فیض صاحب
چلے گئے، ہم کچھ نہیں کر سکے ___! اب ظاہر ہے کہ بچے میری اس بات کا کیا جواب
دیتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ فیض صاحب کو موقع ملتے ہی اس کی خبر
کر دیتے سو وہ کر دیتے تھے۔ اب یہ فیض صاحب کا حسنِ بیان تھا کہ وہ کسی نہ کسی
طور اس کا ذکر کر دیتے۔ ماسکو سے واپسی پر انہوں نے لندن سے مجھے جو خط لکھا اس
سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو کیسے محسوس کرتے تھے اور انہیں کیسے دیکھتے
تھے۔

پیاری سرفراز

دو تین دن پہلے ماسکو سے چلتے وقت تمہارا بہت اداس خط ملا تھا۔ اداسی
یہاں کیا کم ہے؟ تم تو پھر بھی گھر میں، بچوں کے پاس ہو۔ یہاں تو ابھی تک سر چھپانے
کے لئے کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ملا۔ مسافر نواز تو بہتیرے ہیں لیکن ان کی تواضع سے

دل کی پیاس کب بجھتی ہے۔ تمہاری ہنستی ہوئی صورت تو اکثر سامنے رہتی ہے کیونکہ رونا تو تمہیں بالکل SUIT ہی نہیں کرتا۔ سیر و تماشا کی ہوس تو بہت پہلے پوری ہو گئی تھی۔ اب تو اس سے "ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے" کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں اور بدن ٹوٹنے کی چارہ گری پردیس میں کون کر سکتا ہے۔ ایلس واپس گھر چلی گئیں۔ تم سے ملاقات ہو تو باقی حالات ان سے پوچھ لینا۔ مینا تو میں نے سنا تھا آسٹریلیا چلی گئی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا پتہ لکھ بھیجو۔ اسے ضرور خط لکھیں گے۔ دیمی کو بہاولپور کے پتہ پر کارڈ بھیجا تھا، غالباً اسے مل گیا ہوگا۔ اور مانو کی جہاں بات چل رہی تھی اس کا کیا ہوا اور اس کے امریکہ جانے کا کیا ہو رہا ہے۔ امریکہ میں تو بہت سے اچھے لڑکے موجود ہیں لیکن اتنی دور سے کوئی بات کیونکر طے ہو سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جب بھی ہو سکے اسے امریکہ بھجوا دیں، ہم نے بہت سے شہروں میں واقفیت پیدا کر لی ہے جو اس کی دیکھ بھال کر لیں گے اور تمہارے لئے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمہیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں تم میاں سے مہینہ بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آ جاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمہیں صحیح سالم واپس کر دیں گے۔

انگلستان میں نو دس مئی تک قیام۔ پھر واپس ماسکو جانا ہوگا تم دونوں میں سے کسی پتہ پر جواب بھیج دو۔ کچھ اشعار تمہیں پروفیسر سجاد حیدر (PNCA) کے ہاتھ بھیجے تھے، تمہیں ملے یا نہیں؟ کچھ اور سن لو:

بہت سا پیار۔

فیض

جو میرا تمہارا رشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا، عہدِ وفا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
"اسی[1] انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

---

[1] مخدوم محی الدین کا مصرعہ ہے۔

فیض صاحب کی یہ نظم پاکر مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس معصوم سے ننھے پرندے کی طرح ہوں، جو تیز حبس کے موسم میں دور سے آنے والی بارش کی خوشبو پاکر بے قرار ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میں خود سے بے خبر ہو کر محض اڑتی جا رہی ہوں۔ یہ نظم دوستوں نے دیکھی تو ہر ایک نے بے پناہ داد دی۔

ادھر مختلف اخبارات و رسائل والوں نے مجھ سے رابطہ کرنا شروع کر دیا کہ فیض صاحب کی کوئی نئی چیز میسّر ہو تو اس کو شائع کیا جائے۔ ان سب کا ذکر تو مناسب نہیں لیکن ان میں جنگ (راولپنڈی) اور نیرنگِ خیال قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے وابستہ دوستوں کے مسلسل اصرار کے بعد میں نے فیض صاحب کو اس سے آگاہ کیا تو انہوں نے میری بات مان لی۔ انہوں نے ماسکو سے لکھے جانے والے اس خط میں اس جانب اشارہ بھی کیا۔ اس خط کی ایک اور پہلو سے اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں انہوں نے ایفروایشیائی ادیبوں کے سہ ماہی رسالے "لوٹس" LOTUS کی ادارت قبول کرنے کی خبر دی جو ظاہر ہے کہ پورے ملک و قوم کے لئے ایک اعزاز تھا۔ انہوں نے لکھا:

پیاری سرفراز

تمہارا قریباً دو ماہ پہلے کا لکھا ہوا خط ابھی کچھ دن پہلے ملا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ گذشتہ مہینہ کے شروع میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں انگولا (ANGOLA) جانا پڑا جہاں سے قریباً پورے مہینے کے بعد ابھی واپسی ہوئی ہے لیکن اب بھی پاؤں رکاب میں ہے اگلے ہفتے یاسر عرفات صاحب کی دعوت پہ بیروت روانگی ہے۔ غالباً چار پانچ دن قیام ہو گا پھر شاید کہیں کچھ دن چین سے بیٹھنا ہے۔ کانفرنس میں ایفروایشیائی ادیبوں کے سہ ماہی رسالے کی ادارت اب باقاعدہ ہمارے حوالے کر دی گئی ہے۔ صرف یہ طے کرنا باقی ہے کہ اپنا دفتر کہاں رکھیں۔ اگرچہ میں نے نوٹس دے دیا ہے

کہ موجودہ ہنگامی حالات سنبھل جانے کے بعد ہم اپنا دفتر اپنے گھر میں ہی رکھیں گے۔ وہ تو خیر جب ہوگا سو ہوگا لیکن اس سے پہلے ہم اکتوبر نومبر میں گھر کا ایک چکر ضرور کریں گے، تمہاری دو تین سال کی تاریخ کا کون انتظار کرے۔ (لیکن وہ دعوت نامہ اپنی جگہ ہے۔ دو تین سال کے بعد سہی) اس لئے چند روز مری جان، اگرچہ یہ چند روز بالکل شیطان کی آنت ہوتے جا رہے ہیں اور صبر تو مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ نہ کریں تو کیا کریں۔ اور وہ تو غالباً شیخ سعدی کی کہانی ہے کہ ایک بار ان کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے تو اللہ میاں سے شکایت کرنے کو جی چاہا لیکن پھر ایک فقیر کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو اللہ میاں کا شکر ادا کیا۔

'جنگ' اور 'نیرنگ خیال' دونوں کی فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔ کچھ شعر لکھے تھے لیکن وہ عبداللہ ملک اپنے رسالے کے لئے لے گئے ہیں۔ (ویسے ان کے ساتھ بڑا اندوہناک سانحہ ہو گیا۔ میاں بیوی بلغاریہ کے دورے پر آئے تھے۔ بیوی پہلے چلی گئیں اور یہ تاشقند وغیرہ کی سیر کے لئے چلے گئے۔ یہاں پہنچے تو بیوی کی وفات کا تار رکھا ہوا تھا۔ بہت پریشان گئے ہیں)۔

ویسے تم سن لو:

"لاؤ تو قتل نامہ مرا"

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی"

(یہ داغؔ کا شعر ہے)

مینا کو خط لکھ رہا ہوں، اور مانو کے رشتے کا کیا ہو رہا ہے؟ بھئی جلدی کیا ہے۔ انگریزی محاورے میں تو شادیاں آسمانوں پر طے ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہو جائے گی۔ اچھا اب تم ہنس کر دکھاؤ۔ باقی باتیں وہاں آکر ہوں گی۔ بہت سا پیار

فقط

اس کے بعد فیض صاحب پروگرام کے مطابق ماسکو سے بیروت چلے گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ اپنی مصروفیات میں اُلجھے رہے مگر جونہی ان کو فرصت ملی انہوں نے مجھے خط لکھا۔ اس تمام عرصہ میں میں ایک طرح کی اُلجھن کا شکار رہی کہ نہ جانے کیا بات ہے جو فیض صاحب کا خط نہیں آرہا۔ بیروت ـــــ یوں تو خوابوں اور سپنوں کا شہر تصور کیا جاتا تھا مگر ان دنوں اس کے رنگوں اور خوشبوؤں پر فائرنگ اور بارود کی بُو حاوی ہوتی جارہی تھی۔ صدیوں کی تہذیب کا گہوارہ آگ اور خون میں نہاتا جارہا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی۔ یہ کیسی سیاست ہے جو ایک دوسرے کو محبت سے باہوں میں سمیٹ لینے کے بجائے انہی بازوؤں کو کاٹ دینے پر مامور ہے۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ہمیں مزید چھوٹے چھوٹے خانوں میں کون تقسیم کر رہا ہے۔ ہم ایک طرح کی سوچ رکھنے والے مل کر اس آزار سے نجات کیوں حاصل نہیں کر لیتے۔ ادھر سے آنے والوں سے میں نے سنا تھا کہ ہر شام ایک نئی جولانی اور دیوانگی کے عالم میں روشنیوں اور دھنوں میں ڈوب جانے والا بیروت اب اُداس اور ملول ہوتا جارہا ہے مگر اس کا ایک رُخ فیض صاحب کے خط سے بھی محسوس ہوا:

لے داغؔ

پیاری سرفراز اینڈ کو

تمہیں اس سے پہلے صرف اس وجہ سے نہیں لکھا کہ اپنا کوئی پتہ طے نہیں تھا۔ کچھ دن ماسکو اور بیروت کی گفت وشنید میں لگے پھر یہاں دفتر اور رہنے کی جگہ تلاش کرنے میں کچھ وقت گزرا۔ اب یہ ٹھکانہ ملا ہے۔ چھجو کے چبارے والی بات کہاں، لیکن پھر بھی کم از کم منظر پُر فضا ہے۔ سمندر کے کنارے دو ملحقہ فلیٹ ہیں۔ بہت مختصر گنجائش ہے یعنی دو کمروں میں گھر اور دفتر۔ لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ کم از کم ہوٹل اور ہوائی جہاز سے نجات ملی۔ اور پھر کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہے البتہ لبِ ساحل جو عالیشان ہوٹل اور ریسٹوران تھے سب تباہ ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ ٹوٹی ہوئی دکانیں اور نیم پختہ جھگیاں بن گئی ہیں۔ اس میں ایک فائدہ ہے کہ ضرورت کی ہر چیز دو قدم پر موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی لمبی بیکاری کے بعد اب ہم کام پر لگ گئے ہیں۔ جس کا یہ مطلب نہیں کہ جی بھی لگ گیا ہے۔ پریشانیٔ دل کا تو اپنے گھر کے علاوہ کوئی بھی علاج دنیا میں موجود نہیں، خیر کبھی وہ دن بھی آجائے گا۔ پھر کچھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ گھر دور سہی لیکن پہلے جیسا دور نہیں ہے۔ آپ لوگ کس حال میں ہیں۔ سفر کیسا گزرا اور جاتے جاتے یہ مکہ میں تم نے کیا شرارت کی ہے۔ اللہ کے گھر میں تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

ایلس ابھی تک نہیں آئیں۔ آجکل میں یہاں پہنچنے کی امید ہے۔ اس دوران میں ہم نے کم از کم ناشتے کے لئے چائے بنانا اور انڈا ابالنا سیکھ لیا ہے جو کافی بڑا کارنامہ ہے۔ کھانا ایک خاتون آکر کھلا دیتی ہیں۔ ہوٹل میں کافی رونق تھی۔ یہاں دفتر کے وقت کے بعد محض تنہائی ہے لیکن پھر بھی پہلے کی طرح بے اطمینانی نہیں ہے۔ پڑھنے لکھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ ایک آدھ دوست بھی مل گئے ہیں اور موسم بہت خوشگوار ہے اور یہاں تک ہوا ہے کہ ہم ہر روز ایک دو میل

پیدل بھی گھوم آتے ہیں۔ (اگرچہ جناب یاسر عرفات نے صرف ایک دو ملاقاتوں کے بعد ایک گاڑی بھی مرحمت فرما دی ہے) اور کوئی خاص بات لکھنے کو نہیں ہے۔ صرف شام ہوتے ہی اِدھر اُدھر سے کبھی مشین گن کی گڑگڑاہٹ، کبھی بموں کے دھماکے سنائی دیتے ہیں۔ لیکن یہاں کا معمول ہے اس لئے کوئی خاص نوٹس نہیں لیتا۔

تم نے دو نظموں کی فرمائش کی تھی جو بھیج رہا ہوں۔ سب کو بہت سا پیار۔

اَے وطنِ عزیز

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے وطنِ عزیز
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کرے
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

ترے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہراہوں میں سنگسار ہوئے

---

[1] "بلا کشانِ محبّت سے جو ہوا، سو ہوا
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو، ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا"

---

[1] سودا

لے "اساں کیہہ کیہہ جند تے جالیا، تُسی کیہہ کیہہ لیکاں لائیاں
واہ رے سجن
کنیاں کیتیاں تُسی ساڈے نال برائیاں"

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشّاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

پیرس

دن ڈھلا کوچہ و بازار میں صف بستہ ہوئیں
زرد رُو روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے رم جھم برسیں
اک بھرے شہر کی نا آسودگیاں
دُور پسِ منظرِ افلاک میں دُھندلانے لگے
عظمتِ رفتہ کے نشاں
پیش منظر میں کسی سایۂ دیوار سے لپٹا ہوا
سایہ کوئی
دوسرے سائے کی موہوم سی اُمید لئے
روزمرّہ کی طرح

لے میرا دفیض کا، پنجابی گیت

زیرِ لب
شرحِ بے دردیٔ تنہائی کی تمہید لئے
اور کوئی اجنبی
روشنیوں، سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہوا

بیروت سے فیض صاحب نے ایک خط مجھے دسمبر میں تحریر کیا۔ اس خط میں انہوں نے بہت ہی زیادہ شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں ذکرِ احوال کیا۔ دراصل ایسا انداز اور رویہ وہ محض دلداری کی خاطر اختیار کیا کرتے تھے اور ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مجھے ہنسنے اور مسکرانے کا سامان فراہم کریں۔ ان کی شخصیت کا ایک نہایت دلآویز اور من موہنا پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دوستوں کو اُداس یا پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اپنے آپ میں وہ کتنے ہی طوفانوں کو چھپائے سمندر کی طرح پُر وقار، خاموش اور پرسکون رہتے۔ اس بار واقعی ان کا خط مجھے اس وقت ملا جب میں ایک بار پھر اداسی اور ملال کے موسموں سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے لکھا:

پیاری سرفراز

آج بہت دنوں کے بعد تمہارا خط ملا۔ یہ خوب ہے کہ خود خط نہیں لکھتیں، اور اُلٹی ہم سے شکایت ہے کہ خطوط میں وقفہ لمبا ہے۔ یہ وقفہ حساب کتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہاں ڈاک کا نظام گڑبڑ ہے کہ جب تک خط کی رسید نہ آجائے ہمیشہ شبہ رہتا ہے کہ پہنچا بھی یا نہیں۔ اور نہیں پہنچا تو دوبارہ لکھنے کا فائدہ؟ البتہ اس بار جتنی دیر چاہو، اس لئے کہ ہم مہینہ بھر کے لئے باہر جا رہے ہیں۔ ایلس اگلے ہفتہ دو ماہ کے لئے گھر جا رہی ہیں اور یہاں اکیلے

رہنا مشکل ہے اس لئے کہ ابھی تک کسی سے آشنائی ہی نہیں ہوئی۔ یہ طے نہیں ہو سکا کہ کہاں جائیں، ماسکو، لندن یا ہندوستان۔ اور دو چار دن کے بعد طے کریں گے۔

تو آخر تمہارے میاں کا سعودی عرب جانے کا خواب پورا ہو ہی گیا اور تمہارا بھی، لیکن بچارا آدمی اکیلا تمہاری رکھوالی کب کرے گا۔ ہمیں واپس آنے دیا ہوتا۔ بہرصورت تمہیں نیا گھر مبارک ہو۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس لئے اس کا کوئی شعور قائم نہیں کر سکے۔ اس میں ہمارا کوئی کمرہ ہو گا۔ خیر کبھی وہ بھی ہو جائے گا۔ لیکن اگر تمہارا RETIRE ہونے کا بھی ارادہ نہیں تو اس دوران میں کیا ہو گا۔ خالد سعید بٹ کو لکھتے ہیں کہ جاسوسی کے فرائض انجام دے۔ اہلِ قلم کے[1] دربار کا کچھ حال جنگ اخبار میں پڑھ لیا ہے۔ اچھا ہے کہ ہم وہاں نہیں تھے ورنہ وہاں جانے پر بھی انگلیاں اٹھتیں اور نہ جانے پر بھی۔ انہی تماشوں کی وجہ سے گھر جانے کے خیال سے وحشت ہوتی ہے۔

یہ جنگ والا سوال نامہ تو بالکل بچگانہ چیز ہے۔ پہلے بھی کسی نے بھیجا تھا اس لئے واپس کر دیا تھا۔ نوجوانوں چھوکروں کے لئے ٹھیک ہے جو اپنی ہر طرح کی نمائش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان باتوں کا کیا جواب دیں۔

تم نے اب تک گھر بدل لیا ہو گا۔ اس لئے نئے پتے پر لکھ رہا ہوں۔ یہاں سے تو ٹیلی فون کرنا ممکن نہیں، کسی اور شہر سے ضرور کوشش کریں گے۔ شاید آئندہ سال پہلے کی طرح کہیں ملاقات کی بھی صورت نکل آئے اور یہ تم نے اپنی چیز کی کیا ضد لگا رکھی ہے۔ تمہیں جو چیز بھی پسند آئے تمہاری ہے۔ کینیڈا میں ایک ہندوستانی خاتون نے کہا آپ کی اردو ذرا مشکل ہے، ہماری ہندی زبان میں بھی

---

[1] کل پاکستان اہلِ قلم کانفرنس

کچھ لکھیئے۔ میں نے کہا سوچیں گے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتی ہیں؟ کہنے لگیں باتیں کرتی ہوں۔ یہ بات ہمیں بہت پسند آئی اور اگلے دن ہم نے یہ گیت لکھا :

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی گیت بنائیں

(جیا سمجھتی ہو نہ، مرؔدے جلانا)

جن کی رہ تکتے جُگ بیتے
چاہے وہ آئیں، نہیں آئیں
آنکھیں موندھ کے نت پل دیکھیں
آنکھوں میں ان کی پرچھائیں
اپنے اوروں کا تاج سجا کر
بے دردی کے سامنے جائیں
جب رونا آوے، مُسکائیں
جب دل ٹوٹے، دیپ جلائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ بھی نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیضؔ ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

دو شعر اور تھے :

اپنے انعامِ حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا

آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

باقی پھر سہی ۔ بہت سا پیار

کچھ عرصہ کے بعد میرا دوسری بار حج کا پروگرام بنا۔ میں نے فیض صاحب کو لکھا: "آپ بھی اس مبارک موقع پر ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں"۔ میں کافی دن تک ان کے خط کا انتظار کرتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یا تو اپنے پروگرام کے مطابق کہیں باہر چلے گئے ہوں گے اور یا پھر خط کا جواب دینے کی بجائے کسی اور ضروری کام میں مصروف ہوں گے۔ البتہ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب چند دنوں کے بعد ہی ان کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا:

پیاری سرفراز اور فیملی

تمہیں ایک خط بہت پہلے لکھا تھا، شاید اب تک پہنچ گیا ہو۔ رسید نہیں آئی اس لئے یہ دو حرف محض اطلاع کے لئے ایک دوست کی بیگم[1] کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں مینا کا خط آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوش بھی ہے اور کچھ اداس بھی۔ مانو کے امتحان کی اطلاع آئی کہ نہیں۔ ہم دونوں یہاں آرام سے ہیں۔ پردیس تو ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم گھر سے فاصلہ کم ہے۔ اقبال[2] کس حال میں ہیں؟

تم سے ملاقات ہوئی بھی تو بہت کم، اتنا ہی سہی۔ آئندہ سال کے کیا ارادے ہیں؟ (آئندہ نہیں اس سال)، اب تو تم نے دنیا کا چکر کرنا سیکھ لیا ہے۔ ایک حج اور کر لو (یعنی عمرہ) تو اس بہانے سے ہم بھی گناہ بخشوا لیں گے۔

سب کو بہت سا پیار — فیض

---

[1] مسز نسیم [2] میرے شوہر اقبال

فیض صاحب کے دل میں مکہ اور مدینہ کی تڑپ اور محبّت کا اندازہ ان کے خط کے اس آخری جملے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات ان لوگوں کے لئے بھی لمحہ فکریہ ہے جنہوں نے اس درویش صفت اور انسان دوست شخص کے جذبۂ ایمان کو معلوم نہیں کیوں ہمیشہ شک کی نگاہوں سے دیکھا۔

ان ہی دنوں میری بیٹی مانو کی شادی طے پاگئی اور خدا کے فضل و کرم سے میں نے یہ فرض بخوبی انجام دیا۔ فیض صاحب کی کمی ہم سب نے بری طرح محسوس کی لیکن وہ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے کیونکہ ان کو میرے دوسرے بچوں کی طرح مانو سے بہت پیار تھا۔ اس شادی کی خبر مجھ سے پہلے انہیں ان کی بیٹی منیزہ نے پہنچا دی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے لکھا:

پیاری سرفراز

تمہارا خط ملا، مانو کی خوشخبری میزو کے خط سے پہنچ چکی تھی۔ مجھے بھی افسوس ہے کہ نکاح خوانی کے لئے ہم موجود نہیں تھے۔ خیر جیسے تم نے کہا ہے ابھی تو تین بچے اور ہیں، جب تک ہم خطبہ نکاح بھی دوبارہ یاد کر لیں گے۔ کسی زمانے میں یاد تھا جب ابن انشاء مرحوم نے ہماری نکاح خوانی پر کالم لکھا تھا۔ اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تمہارا آدھا بوجھ ہلکا ہوا اور ساتھ ہی تمہیں امریکہ کی سیر کرنے کا بہانہ بھی ہاتھ آگیا۔ بچے خیر سے گھر پہنچ جائیں تو ان کا پتہ بھی لکھ دینا۔ شاید کبھی اُدھر جانا ہو سکے۔ کینیڈا سے ایک دعوت آئی رکھی ہے۔ اگر وہاں جانے کی صورت ہوئی تو پھر امریکہ کچھ ایسا دُور نہیں۔

مینا کا نئے سال کا کارڈ آیا ہے۔ میں نے کہیں اس سے کہا تھا کہ ہمارے گھر آنے سے پہلے شادی مت کروانا۔ اُس نے مذاق میں لکھا ہے کہ ہم یہ پروگرام جلد طے کریں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ شاید اسے P.H.D کی اجازت مل جائے گی۔

یہاں پر دن ویسے ہی گزر رہے ہیں۔ گھر کے حالات کے بارے میں پریشانی ہے اور عزیزوں، دوستوں کی جدائی کا رنج، لیکن مجبوری ہے۔ بیچ میں کہیں اچھے لمحے بھی آجاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے ہم نے اپنے دفتر کا رسمی افتتاح کیا تھا جس میں شہر کے ادیبوں اور سیاسی لیڈروں کے علاوہ خلاف توقع یاسر عرفات خود بھی تشریف لے آئے جو ایسی تقریبات میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی تصویریں چھیمی[1] کو بھجوائی ہیں۔ تم اُدھر جاؤ تو دیکھ لینا۔ تمہارے لئے نیا CASETTE تو بن جائے گا لیکن ڈاک میں نہیں بھجوا سکتے۔ کوئی ادھر جانے والا ملے گا تو بھجوا دیں گے۔ بہت دنوں سے کچھ لکھا بھی نہیں گیا۔ شاید یاد کے زخم کچھ بھرنے لگے ہیں، یا غریب الوطنی کا احساس کم ہو گیا ہے۔ غالباً اگلے ہفتہ برلن جانا ہو گا اور مارچ میں ہندوستان کی دعوت ہے۔ اگر وہاں جانا ہوا تو ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کریں گے۔

بہت سا پیار

فیضؔ

اس خط سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک قابلِ رشک رتبہ حاصل کرنے کے باوجود وطن کی محبّت میں کس شدت سے مبتلا تھے۔ انہیں ایک بین الاقوامی سطح پر ممتاز حیثیت حاصل تھی مگر وہ اپنے دیس کو یاد کرتے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر وطن کی مٹی اور اپنوں کی خوشبو چھائی ہوئی تھی لیکن وہ یہاں رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی باتوں میں ایک ہلکی ہلکی سی آنچ اس الاؤ کی صاف طور پر دکھائی دیتی تھی جو ان کے دل میں ارضِ وطن کے لئے دہک رہا تھا۔

اس کے بعد وہ اپنے پہلے پروگرام کے تحت بیروت سے واپس چلے گئے اور اس دورہ کے اختتام پر انہوں نے مجھے خط لکھا:

---

[1] فیض صاحب کی بیٹی سلیمہ ہاشمی

پیاری سرفراز

آخر تمہارا خط آیا۔ ورنہ اب تو شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید تم بھی میاں کے ساتھ عرب شریف چلی گئی ہو۔ خیر اب اطمینان ہو گیا۔ مجھے بھی یہاں آئے دو ہی دن ہوئے ہیں۔ پہلے ماسکو میں، پھر انگلستان میں لوگوں نے سالگرہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ماسکو میں دو جلسے ہوئے۔ بہت لوگ آئے، بہت مقالے پڑھے گئے۔ ہندوستان، بنگلہ دیش اور فلسطین کے سفیروں کے ساتھ ہمارے سفیرِ صاحب بھی تشریف لائے اور تقریر بھی کی۔ بہت بھلے آدمی ہیں۔ ۱۳ر فروری کے لئے برمنگھم جانے کا پرانا وعدہ تھا۔ وہاں صرف دوستوں کی محفل تھی۔ بہت سی رسمیں کی گئیں۔ لڑکیوں نے آرتی اتاری۔ گھر والوں نے ذبح کر کے گوشت کا صدقہ دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگلے دن لندن سے افتخار عارف نے لاہور کی تقریب کا حال ٹیلیفون پر سنایا۔ ہم ان باتوں سے خوش ہو رہے تھے کہ لندن سے ہمارے پرانے اور عزیز دوست افضل (جن کا گھر تم نے دیکھا ہے) کی بیوی کا ٹیلیفون آیا کہ افضل کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے فوراً لندن پہنچیے۔ پندرہ کی صبح کو ایک دوست کی گاڑی پر افضل کے گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ تو اسی صبح اللہ کو پیارے ہو چکے۔ موت کے اس اچانک وار سے جو دل پہ گزری وہ اپنی جگہ لیکن اس پر اضافہ یہ کہ لندن میں مر جانے کے بعد دو گز زمین حاصل کرنا اور کسی مسلمان کے لئے تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا کتنا پیچیدہ اور کتنا مہنگا سودا ہے۔ کچھ مہربان دوستوں کی دوڑ دھوپ سے دو تین دن میں یہ سب کچھ طے ہوا جس کا غبار ابھی دل سے نہیں اترا۔ اگرچہ ہم اتنے عزیزوں کو رخصت کر چکے ہیں کہ اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے، خیر۔ ہمارا تو ابھی گھر کا چکر لگانے کا ارادہ تھا لیکن بعض دوستوں نے روک دیا کہ ابھی موسم اچھا نہیں۔ بہرحال اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ

یہاں کا کام نپٹا کر اس سال کے آخر تک لوٹ آئیں گے۔ واقعی بن باس بہت ہو گیا ہے۔

افتخار عارف نے اس پر اپنی نظم کے کچھ بہت اچھے شعر سنائے تھے وہ ختم کر کے تو تمہیں بھیج دیں گے۔ ہم نے بہت دنوں سے کچھ لکھا نہیں تھا اس DEPRESSION کی وجہ سے۔ پھر بھی کچھ شعر ہوئے جو سن لو۔ لیکن یہ چھپنے کے لئے نہیں ہیں اس کے حقوق کسی نے پیسے دے کے اپنے نام محفوظ کر لئے ہیں[1]۔

ہم مسافر یونہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے
کس قدر ہو گا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تری یاد سے جس روز اتر جائیں گے
جوہری بند کئے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے
نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
شاید اپنا بھی کوئی بیت حدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا مرے یار، جدھر جائیں گے
فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

---

[1] اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے "امیر" تھے۔ گویا یہ پراپیگنڈہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ان کے سامنے مالی مشکلات یا مسائل نہیں تھے۔

تم نے ہمارے دوست میر صاحب[1] کو بھی دریافت کر لیا۔ بھلا تم سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ لیکن کسی خوبصورت عورت کو میر صاحب کی رکھوالی میں دینا تو گوشت اور بلی والا معاملہ ہے۔ بہرصورت ہمارا بہت محبت بھرا اسلام انہیں پہنچا دینا۔ یہ سب باتیں ہمارا بھی تم سے زبانی کرنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن یہاں سے پاکستان کا ٹیلیفون قریباً ناممکن ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد کہیں اور جانا ہوا تو کوشش کریں گے۔ لندن میں ڈاکٹر آفتاب[2] سے ملاقات رہی اور اپنا کمرہ یاد آتا رہا۔ غالباً تمہیں بتائیں گے۔

بہت سا پیار

میرے بیٹے دیمی (ندیم)، کے ساتھ فیض صاحب کی خاص پکی دوستی تھی۔ شاید اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ جب بھی آتے تھے دیمی ان کے ساتھ کمرے میں ہوتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرتے رہتے، معلوم نہیں کیا کیا باتیں ـــــ ؟ میں گھر میں گھومتے پھرتے جب انہیں باتیں کرتے دیکھتی تو سوچتی : کہتے ہیں کہ فیض صاحب کم گو ہیں مگر یہ دیمی سے اتنی باتیں کیسے کرتے جاتے ہیں۔ یہ بات مجھے اُس وقت بھی سمجھ نہیں آسکی تھی اور اب بھی مجھے اس کی خبر نہیں۔ بہرحال ان ہی دنوں فیض صاحب کا خط دیمی کے نام آیا :

پیارے دیمی

تمہارا خط ملا۔ تم نے اس سال میں کتنے خط لکھے ہیں جو ہم سے بھول جانے کی شکایت ہو رہی ہے۔ ہمیں تو ۱۰۴ نمبر بنگلے والا وہ لڑکا اچھی طرح یاد ہے جس کے کمرے میں ہم ٹھہرا کرتے تھے اور جو اب تک لڑکے سے نیم حکیم بن چکا ہوگا۔ پورا حکیم نہ جانے کب بنے گا۔ اس لئے کہ وہاں کی سرکار لکھنے پڑھنے کا کاروبار چلنے ہی نہیں دیتی۔ ان کی تعلیمی پالیسی تو غالباً حضرت بُلھے شاہ کے کہنے پر عمل کر رہی ہے۔ آپ

---

[1] میر علی احمد تالپور (مرحوم)، [2] فیض صاحب کے ایک دوست جو آجکل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

نے فرمایا تھا :

علموں بس کریں او یار

اکّو الف تیتوں درکار

آپ کو بڑا گھر مبارک ہو۔ ہمارے وہاں ٹھہرنے کی باری تو معلوم نہیں کب آئے گی۔ لیکن جب بھی آئے گی تمہارے کمرے سے فائدہ اٹھانے کی ضرور کوشش کریں گے۔ اب تک تمہارا ایک آدھ امتحان تو ہو چکا ہوگا۔ کیا نتیجہ نکلا ؟ اور تمہاری کرکٹ کس حال میں ہے ؟

بہت سا پیار

انکل

جیسا کہ اس سے پہلے بھی میں کہیں کہہ چکی ہوں کہ کینیڈا میں ایک خاتون نے فیضؔ صاحب سے کہا 'میں تو صرف باتیں کرتی ہوں' ــــــ اور فیضؔ صاحب نے اس سے خوش ہو کر ایک گیت لکھ دیا۔ میں نے یہ گیت خط میں پڑھا تو میں نے فیض صاحب کو لکھا: 'میں بھی تو باتیں کرتی ہوں'۔ تو انہوں نے اس پر مجھے یہ خط لکھا :

پیاری سرفراز

اب کے تو تمہارا دوسرا خط بہت جلد مل گیا۔ پہلے خط کا جواب تمہیں مل چکا ہوگا ہم پانچ سات دن کے لئے چھٹی کرنے شارجہ اور ابوظبی چلے گئے تھے۔ جہاں ایلس اپنی بھانجیوں سے ملنے گئی تھیں۔ کل ہی واپس پہنچے ہیں۔ وہاں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ ہر کوئی دولت سے مالا مال ہے لیکن زندگی سے بیزار۔ دن بھر پیسے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور شام کو تھکے ہارے گھر آتے ہیں اور تھکن دور کرنے کے لئے پارٹیوں میں اودھم مچاتے ہیں۔ بالکل کولہو کے بیل کی سی زندگی ہے۔ سب کو ایک ہی رونا ہے کہ گھر جانے کو جی ترستا ہے لیکن وہاں کھائیں گے کیا۔ وہیں گھر کے بارے میں

چند تشویشناک خبریں بھی ملیں کہ ملّی کے ساتھ گھُن بھی پس رہا ہے۔ اللہ رحم کرے اور لوگ پھر سکھ چین سے زندگی کے دن گزار سکیں۔ بچّوں سے بات ہوئی تھی وہ صابر و شاکر ہیں۔ بہرحال جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

تم نے چاہنے والوں کا ذکر کیا ہے، وہ تو ہیں اور اللہ انہیں خوش رکھے لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے، نہ مل سکتا ہے جو حسن اتفاق سے وہاں میسّر آگیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو —— تم اچھی ضرور لگتی ہو لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے۔

اور میر[1] صاحب جو ہمیں دُور رکھنا چاہتے ہیں، وہ نہ جانے ہماری وجہ سے یا تمہاری وجہ سے —— بہرحال دور تو شاید ابھی رہنا پڑے لیکن شاید پچھلے سال کی طرح قریب ہونے کا بھی کوئی موقع ہاتھ آجاتے۔ مئی جون میں کینیڈا والوں نے دوبارہ بلا رکھا ہے۔ مانو نے لکھا تھا کہ شاید گرمیوں میں وہ تمہیں بھی بلا بھیجیں۔ اگر ایسی کوئی صورت ہوئی تو ہمیں پہلے سے بتا دینا۔ اگلے مہینے ہندوستان والوں نے بلا رکھا ہے۔ وہ بھی سالگرہ منانا چاہتے ہیں۔ ابوظہبی والوں نے بھی کافی ہنگامہ کیا، لیکن اس سے تھوڑی دیر کے لئے دل بہل جاتا ہے جس سے اداسی کا ازالہ نہیں ہوتا لیکن فی الحال یہی غنیمت ہے۔

یہاں پر آجکل پہلے کی نسبت کچھ سکون ہے، دیکھئے کتنے دن رہے۔

بہت سا پیار

اس خط میں بھی گذشتہ کئی خطوں کی طرح فیض صاحب نے وطن سے محبت کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پاکستان سے دور تھے مگر ان کے دل میں ہر آن اس کی محبت کا چراغ

---

[1] میر علی احمد تالپور

روشن تھا۔ کوئی معمولی سی بات ہو جاتی تو وہ کانپ کر رہ جاتے ۔۔ وسوسوں اور اندیشوں کے مارے ۔۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ پیارا وطن کن مشکلات اور مسائل سے دوچار ہے۔ وہ ایک دور اندیش دانشور ہونے کے ناتے اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ قوم کے سروں پر منڈلاتے خطرات تاریخ اور اس کا حوالہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ان کی سالگرہ کے جشن منانے کے پروگرام طے پاتے اور جب ان کو اس کی خبر ہوتی تو وہ اور زیادہ اداس ہو جاتے ۔۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اپنی سالگرہ لاہور، کراچی، اسلام آباد، کوئٹہ یا پشاور میں منائیں۔ خواہ جشن نہ ہو، محض ایک موم بتی، چند دوست اور محبّت کی خوشبو ۔۔۔ لیکن یہ تو محض خواب تھے، تعبیر تو یہ تھی کہ ہجرتوں کا مارا مسافر بے وطنی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ یہی وہ باتیں تھیں جو ان کے جی کا روگ ہو گئیں۔ اور جو ان کے دوستوں کے دل پر آج بھی داغ ہیں۔

ابھی میں ان کے اسی ملال کی زد میں تھی کہ ان کا ایک اور خط آیا جس میں انہوں نے کچھ دوستوں کا تذکرہ بھی کیا مگر محور وہی وطن۔

پیاری سرفراز

تمہارا کافی پہلے کا لکھا ہوا خط ابھی ابھی کلکتہ اور دہلی سے واپسی پر ملا ہے۔ گذشتہ دو مہینے بہت دن سفر میں گزرے اس لئے ہم بھی پہلے نہیں لکھ سکے۔ کلکتے میں آزادی کے بعد پہلی بار جانا ہوا تھا اس لئے بہت آؤ بھگت ہوئی۔ بڑے بڑے جلسے ہوئے لیکن گھر سے باہر اب ان ہنگاموں سے دل خوش نہیں ہوتا۔ جنگل میں مور ناچنے والی بات معلوم ہوتی ہے۔ دہلی میں کم از کم اتنا ہے کہ لاہور سے بات ہو جاتی ہے اور دلیس کا کوئی جھونکا بھی ادھر آجاتا ہے۔

یہاں کچھ دنوں سے اسرائیلیوں نے پھر یورش برپا کر رکھی ہے۔ جنوبی لبنان میں تو باقاعدہ تباہی مچا رہے ہیں لیکن یہاں بھی ہمارے گھر کے سامنے قریب قریب

ہر رات ان کی کوئی جنگی کشتی آنکلتی ہے، پھر ادھر سے راکٹ چلنے شروع ہوتے ہیں جو ہمارے اوپر سے گزرتے ہیں۔ بالکل آتشبازی کا سا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے اور گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں تو شکر کرنا چاہیئے کہ اپنے گھر پہ کوئی ایسی قیامت نہیں ٹوٹی۔ ذاتی دکھ سے تو چھٹکارا نہیں لیکن اس طرح کی مصیبت سے اللہ بچائے۔

دل کی اداسی کا تو علاج یہی ہے کہ امید سے لو لگاتے رکھیں "آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا" کبھی کبھی ستارے اچانک مہربان ہو جاتے ہیں تو ملاقات کا کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ جیسے تم سے ہوا تھا۔ سال میں ایک بار سہی؛ اس سال میں تو ابھی کافی دن باقی ہیں۔ کیا خبر کسی جگہ کوئی صورت نکل آئے۔

مانو امریکہ کب جائے گی؟ شاید ستمبر، اکتوبر میں ہمارا بھی ادھر جانا ہو سکے۔ ویسے امریکہ تو اتنا بڑا ملک ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کی بھی آپس میں برسوں ملاقات نہیں ہوتی۔ مینا نے P.H.D پر کمر باندھ رکھی ہے تو کر لینے دو۔ شادی کی ایسی کیا جلدی پڑی ہے ہوتی رہے گی۔ تمہیں ایسی کیا فکر ہے۔ اس کی شادی ہے تمہاری تو نہیں ہے۔

خالد سعید[1] کو میز دو کے ہاتھ مبارک باد بھجوا دی ہے۔ تم بھی کہہ دینا۔

'نیرنگِ خیال' کے جوبلی نمبر کے لئے ان کی فرمائش آئی تھی۔ ان کا خط اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ جی چاہے تو منسلکہ چیزیں انہیں بھجوا دینا۔

بہت سا پیار

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام لاہور میں فیض صاحب کو میں نے امرتسر ٹی وی پر ایک انٹرویو دیتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ کمزور سے دکھائی دے رہے تھے۔ علی سردار جعفری

---

[1] ادارہ ثقافت پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل خالد سعید بٹ جو ان دنوں ملازمت پر بحال ہوتے تھے۔

نے اس انٹرویو میں ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک بہت عام سا سوال کیا: پاکستان اور بھارت کے کلچر میں کوئی فرق تو نہیں ہے ناں ؟ ـــ لیکن یہ سوال عام نہیں تھا۔ کیونکہ جب اس عام سوال کا جواب فیضؔ جیسا شخص دے رہا ہو تو یہ سوال بہت اہم بن جاتا ہے۔ اس بارے میں کئی مباحث شروع ہو جاتے ۔ نئے تجزیے اور انوکھے سلسلے چل نکلتے ۔ میں سوچنے لگی ، فیضؔ صاحب بہت خوشگوار موڈ میں ہیں معلوم نہیں اس کا کیا جواب دیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ، فیضؔ صاحب نے اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ علی سردار جعفری کو ایک بھرپور نظر دیکھا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے : نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ـــ فرق تو ضرور ہے ۔ اور اس کے ساتھ علی سردار جعفری نے گفتگو کو بڑی خوبصورتی سے دوسری طرف موڑ لیا ۔ وہ جانتے تھے کہ فیضؔ صاحب سے وہ ـــ وہ باتیں نہیں کہلوا سکیں گے جو ان کا مقصد تھا۔

فیض صاحب کا یہ جواب سُن کر میں خوشی سے جھوم اٹھی ۔ انہوں نے جس وقار اور اعتماد کے ساتھ پاکستان کے تشخّص اور نظریہ کا دفاع کیا اس پر شعبدہ باز سیاستدانوں کے کئی جنم قربان کرنے کو جی چاہتا تھا ۔ حالانکہ فیضؔ صاحب کی جگہ کوئی اور کم ظرف یا بے حوصلہ شخص ہوتا جسے فیض صاحب کے سے حالات سے گزرنا پڑتا تو وہ یقیناً علی سردار جعفری کے سوال کے جواب میں ڈگمگا جاتا ـــ !

میں نے اسی رات فیضؔ صاحب کو خط لکھا اور ان کے انٹرویو کی دل کھول کر تعریف کی ۔ جواب میں انہوں نے مجھے اور میری بیٹی میناؔ ـــ دونوں کو خط لکھے اور اس میں اس بھارتی خاتون کا ذکر بھی کیا جو ان کو بڑی عقیدت اور محبّت سے خط لکھتی تھی ۔ اس کے علاوہ انہوں نے لفٹیننٹ جنرل سروپ[1] خان کا ذکر بھی کیا جو ان دنوں بطور ڈی ایم ایل اے ملتان تعیّنات کئے گئے تھے ـــ فیضؔ صاحب کے وہ دونوں خطوط یہ تھے :

---

[1] سروپ خان فیض صاحب کے مدّاح تھے اور میرے گھر پر ان کی فیض صاحب سے ملاقاتیں بھی رہی تھیں ۔

پیاری سرفراز

کچھ دن پہلے تمہیں لکھا تھا جو مل گیا ہو گا۔ اس کے بعد تمہارا اور مینا کے خط ملے۔ تم نے تو ہمیں TV پر دیکھ لیا لیکن ہم کیسے دیکھیں۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر رکھنی چاہیئے اور "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"۔ اس سے زیادہ آرام دہ صورت تو یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ لی جائے لیکن وہ تو تصویر ہوئی اسْ سے بات کیسے کی جائے یا اس کی آواز کیسے سُنی جائے۔ اگر ہم تمہیں TV پر کمزور دکھائی دیئے تو بہت اچھی بات ہے سگریٹ پینا تو نہیں چھوڑا البتہ کچھ وزن کم کرنے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں تاکہ بڑھاپے میں کچھ وضع قطع تو برقرار رہے ورنہ مارکیٹ بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے تمہاری اداسی کا رونا سُن کر ہمیں اداسی کی بجائے ڈھارس ہوتی ہے کہ کوئی تو یاد کرتا ہے۔

اور یہ تمہیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو بقول شکیل کے تمہیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمہاری یہی صورت رہی تو شاید ان کی اولادوں کو بھی۔ البتہ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے مُنہ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیئے لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات تم سے نہیں کرنی چاہیئے۔

تو تمہارے جنرل سروپ ملتان پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا سلام بھجوا دینا اور یہ پیغام بھی کہ ملتان کافی خطرناک جگہ ہے وہاں سے لوگ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

مینا تو اب جانے والی ہوگی یا جا چکی ہوگی لیکن ماتو کو اب تک رخصت کیوں نہیں کیا۔ کیا پھر اس کے ساتھ یورپ کی عیاشی کا ارادہ ہے۔ اگر ایسا ہو سکے

تو بہت اچھا ہوگا۔ یہاں پر جوں توں دن گزر رہے ہیں۔ میل ملاقات نہ ہونے کے برابر ہے۔ حتّیٰ کہ کوئی شعر سننے والا بھی نہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد بچّوں کے آنے کی امید ہے۔ وہ آجائیں تو کچھ دن دل بہلا رہے گا۔ ہندوستان کے دورہ کی کچھ کیفیت تمہیں اس کتابچے سے معلوم ہو جائے گی لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا۔ اگلے مہینہ لندن جانے کی دعوت ہے وہاں پہنچ کر تمہیں زیادہ یاد کریں گے۔

بہت سا پیار

---

۳ جون

پیاری مینا

کل ہی تمہارا خط ملا ہے۔ جلدی سے لکھ رہا ہوں تاکہ تمہیں جانے سے پہلے مل جائے ورنہ تمہیں امّی بعد میں بھجوا دیں گی۔ خط لکھنے کے بارے میں تمہاری شکایت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، دو تم نے لکھے اور دو ہم نے۔ ہاں شاید ایک کارڈ تمہارے حساب میں زائد ہے جو کوئی ایسی بڑی بات نہیں اور پھر ہم کبھی کبھی اپنے POETIC LICENCE کا استعمال بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سفر بھی درپیش رہتا ہے جس سے خط و کتابت گڑبڑ ہو جاتی ہے لیکن ہم لکھیں نہ لکھیں، جب تمہارے جی میں آئے اپنی بکواس لکھ بھیجا کرو۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم دوبارہ آسٹریلیا فتح کرنے جا رہی ہو۔ امید ہے کہ یہ تمہارا آخری حملہ ہوگا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جو پاکستان بھاگا آرہا تھا یا ایسا کوئی اور تمہیں ہی فتح کر لے اور پاکستان کی ہار ہو جائے۔ لیکن تمہاری چالبازیاں شاید ایسا نہیں ہونے دیں۔

تم نے اپنی اور امّی کی اداسی کا ذکر کیا ہے۔ اب ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اداسی بھی اچھی چیز ہے اس سے یاد تو تازہ رہتی ہے یہ بھی نہ ہو تو بوریت میں اور اضافہ ہو جائے۔

ہندوستان کے سفر سے بہت تسلّی ہوئی۔ ایوارڈ وغیرہ تو کوئی نہیں تھا ایسے ہی کسی نے اُڑا دی ہوگی۔ البتّہ عزت افزائی بہت ہوئی۔ جلسے، جلوس، دعوتیں، قصیدے وغیرہ وغیرہ۔ کلکتے والوں نے تو بہت ہی مبالغہ سے کام لیا۔ اس کتابچے کے علاوہ جو بھیج رہا ہوں، اور بھی بہت سی رسمیں کیں۔ یہاں ہمارے سفیر صاحب نے دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگے: "کلکتے میں بھی آپ کے اتنے گاہک ہیں؟"۔ ہم نے کہا: "صرف گھر ہی میں مرغی کی قیمت نہیں ڈالتے، باہر تو مارکیٹ بہت ہے۔"

اس[1] شہر کا حال ایسا ویسا ہی ہے۔ دو تین دن امن رہتا ہے پھر آتش بازی شروع ہو جاتی ہے۔ پوچھو کہ کون کس سے اور کیوں لڑ رہا ہے تو کوئی کچھ بتاتا ہے، کوئی کچھ اور، اصل مصیبت بے چارے فلسطینیوں کی ہے لیکن وہ اب اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اگلے تین چار ماہ میں ہمیں بہت جگہ جانا ہے۔ لندن، کینیڈا منگولیا، ترکی، ہندوستان، اور ارادہ یہی ہے کہ یہ دورہ ختم کر کے گھر کا بھی چکر لگا آئیں گے۔

بہت سا پیار

انکل

فیض صاحب کی محبّت، اخلاص، حوصلہ افزائی اور پیار ــــ کسی طرح بھی میرے لئے نعمت سے کم نہیں تھا۔ زندگی کے ہر مرحلہ پر ان کی باتوں نے یا خود انہوں نے میری بھرپور راہنمائی کی۔ مجھے ان دنوں ایک عجیب سی سوچ یہی رہتی تھی: فیض صاحب پاکستان میں کیوں نہیں؟ اس سوچ نے میرے دل کے دروازے پر ایک مضبوط ہالہ بُن دیا تھا کوئی اور سوچ اس ہالے سے پار ہو کر اندر نہیں آسکتی تھی اور میری صبحیں اور میری شامیں بس اسی تگ و دو میں گزرتیں کہ فیض صاحب میرے پاس، ہم سب کے پاس کیوں نہیں؟

ان ہی دنوں فیض صاحب کا یہ خط ملا:

---

[1] بیروت

پیاری سرفراز

تمہارا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ فوراً جواب اس لیئے لکھ رہا ہوں کہ تمہیں جلد مل جائے۔ تمہارا کہنا بالکل غلط ہے کہ تمہیں ملاقات کی ہم سے زیادہ طلب ہے۔ تمہارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ (خواہ اس سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ کیوں نہ ہوتی رہے) یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بالکل HOUSE ARREST کی سی کیفیت ہے۔ اسی وجہ سے ہم دامن چھڑا کر کبھی اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے ۴۰۱ نمبر اور اب سُنا ہے کسی نئے تاج محل میں ہے۔

اس لیئے تم اپنا پروگرام اب جلدی سے بنا لو۔ ہمیں پندرہ اگست سے تیس اگست تک کینیڈا اور امریکہ کی دعوت ہے۔ تم اس سے پہلے اپنے میاں کے ساتھ عید کر کے سیدھا امریکہ کا رُخ کرو۔ اگر دو چار دن میں تمہارے جانے کی تاریخیں طے ہو جائیں تو ہمیں فوراً لکھ دو تاکہ ہم آگے سفر کا طے کر سکیں۔

تم نے ٹیلیفون نہ کرنے کی شکایت کی ہے۔ یہاں سے تو پاکستان کا ٹیلی فون ملنا بالکل ناممکن ہے۔ ٹورنٹو کینیڈا سے ایک بار ضرور کوشش کی تھی لیکن لائن نہیں ملی۔ اب ٹیلی فون کی بجائے خود ہی مل لیں تو بہتر ہے۔

ڈاک جا رہی ہے اس لئے ختم کرتا ہوں۔ باقی پھر۔

بہت سا پیار

فیض

اپنی خواہشوں اور اپنی حیرتوں میں ہر شخص کے دن رات اس طرح گندھے ہوتے ہیں کہ اس کے پاس اپنی ذات یا اس سے منسوب رشتوں کے سوا کسی اور کے لئے سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ آنگن میں کھلے ہوئے پسندیدہ پھولوں کو گلدان میں سجانے کا وقت

بھی نہیں جنہیں اگلے روز ہوا اپنے دامن میں اُڑا لے جاتی ہے۔
مجھے کبھی کبھی یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اس کے باوجود ان پھولوں کو بچا لیتے ہیں جنہیں ہوا اُڑا کر لے جانا چاہتی ہے یا جو اپنی رفاقتوں کی چھاؤں پر کسی ناپسندیدہ دھوپ کو حاوی نہیں ہونے دیتے اور ایسے میں میرے ذہن میں صرف اور صرف فیض صاحب کا نام ہی آتا ہے۔ تب مجھے دھیان پڑتا ہے کہ وہ وطن سے دُور رہ کر کس ذہنی کرب — بلکہ عذاب میں تھے۔ دیس سے باہر، پردیس میں ان کو بظاہر تو سب کچھ میسّر تھا لیکن انہیں اس مٹی کی کشش نے بے چین، اداس اور مغلوب کر رکھا تھا۔ وہ بیروت میں ہی تھے جہاں سے انہوں نے مجھے لکھا:

پیاری سرفراز

تم سب کو عید مبارک

پچھلے مہینے تمہیں اور مینا کو خط لکھا تھا۔ آسٹریلیا سے مینا کا جواب تو آ گیا لیکن تمہاری طرف سے رسید نہیں آئی۔ نہ جانے تم نے لکھا ہی نہیں یا مجھے نہیں ملا۔ پچھلا مہینہ بیشتر کچھ سفر میں اور کچھ ہسپتال میں گزرا اس لئے ڈاک میں کافی گڑبڑ رہی۔ ہسپتال کی نوبت تو اس لئے آ گئی کہ ایک دن اچانک اپنے سر کے ساتھ ساتھ ساری دنیا گھومنے لگی جسے VERTIGO کہتے ہیں۔ اتفاق سے روسی ادیبوں کا ایک وفد یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ جبراً جہاز میں بٹھا کر ماسکو لے گئے اور وہاں سے سیدھا ہسپتال بھجوا دیا۔ دو ہفتے ہسپتال میں گزرے اور ڈاکٹروں نے فتویٰ دیا کہ کوئی مرض نہیں ہے محض خلل ہے دماغ کا، یعنی نفسیات یا اعصاب کا قصور ہے۔ صرف آرام اور خوش طبعی کی ضرورت ہے اور یہاں ان دونوں اجناس کی کمی ہے۔ ویسے ہم سمجھتے ہیں کہ اصل خرابی تو عمر کا تقاضا ہے جسے ہم اتنے زمانے سے ٹالتے آ رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے سر تو نہیں جھک سکتا لیکن کمر شاید جھکنے لگے اس لئے کہ سر تو

اپنے بس میں ہے لیکن کمر کے لئے سہاروں کی ضرورت رہتی ہے۔ خاص طور سے صبح سویرے آنکھ کھلنے کے وقت جب لوگ یاد آتے ہیں۔ لیکن بات سفر کی ہو رہی تھی۔ ماسکو سے ہم میزہ اور چھیمی[1] سے ملنے لندن چلے گئے اور وہاں چند دن کافی لطف رہا۔ اس دوران میں ڈاک ہمارے پیچھے پیچھے گھومتی رہی اور ابھی تک کچھ حصہ ماسکو میں رکھا ہے۔ اگلے ہفتے پھر وہاں جانا ہوگا اِدھر سے منگو لیا، تو شاید ہاتھ آجائے۔

لندن میں ایوب مرزا، خواجہ معراج کراچی والے، ہندوستان سے مریم بلگرامی اور کچھ امریکن ملاقاتوں سے ٹکر ہو گئی جس سے کافی دل خوش ہوا۔

ان دنوں یہاں کے حالات بھی کافی بگڑے رہے اور فی الحال ان میں بہتری کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔

چھیمی اور بچے دو تین دن کے بعد واپس جا رہے ہیں۔ پھر ہم دو ہفتے کے لئے منگولیا چلے جائیں گے۔ وہاں سے واپسی پر دو چار دن کے لئے لندن اور اس کے بعد اکتوبر کے آخر میں کوئی دو ہفتے کے لئے کینیڈا۔

ماٹو کی رخصتی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہو چکی ہو تو اس کا امریکہ کا پتہ بھیج دیں شاید کبھی جانا ہو سکے۔

نئی کتاب تیار ہے۔ چھیمی کے ہاتھ چھپنے کے لئے بھیج رہا ہوں۔ غالباً دو تین مہینوں میں چھپ جائے گی۔ کچھ نئی تُک بندی بھی ہے۔

بہت سا پیار (سب کو)

اس کے بعد فیض صاحب بے حد مصروف ہو گئے چنانچہ تقریباً دو تین ماہ تک ان سے رابطہ نہ ہو سکا کیونکہ میں سعودی عرب چلی گئی تھی لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی

---

[1] فیض صاحب کی صاحبزادیاں منزہ اور سلیمہ

دوست کے توسط سے ان کی خیریت کی اطلاع ضرور مل جاتی تھی۔ ان دوستوں کا بھی یہ ہی کہنا تھا کہ فیضؔ صاحب وطن کے لئے ترستے ہی نہیں تڑپتے بھی ہیں۔ بات بات پر پاکستان کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ اپنوں میں بیٹھ کر تو وہ اس ذکر کو بطورِ خاص چھیڑتے ہیں کہ اس سے ان کو ذہنی اور قلبی تسکین ہوتی تھی۔

اُدھر فیضؔ صاحب ایک ملک سے دوسرے ملک ۔۔۔ ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتے رہے اور اِدھر میرے دل ودماغ پر بھی کتنے ہی موسم گزرے۔ کئی بار یوں احساس ہوا کہ میں کسی پہاڑی ریسٹ ہاؤس میں تنہا برف باری کی رات بسر کر رہی ہوں۔ میرے اردگرد، آس پاس کوئی نہیں۔ اگر کچھ ہے تو پاگل ہوا جو دیوانہ وار کسی اپنے کو، کسی کھوئے ہوئے شناسا کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔

یہ پہاڑی ریسٹ ہاؤس مجھے بعض اوقات اپنے کسی بھولے ہوئے جنم کی یادوں کے البم کا پہلا صفحہ محسوس ہوتا ہے۔ اس صفحہ پر کتنی ہی تصویریں ہیں، لیکن ہر تصویر ایک دوسرے سے حیرت انگیز حد تک مشابہ ہے۔ میں مشابہت سے خوفزدہ ہوں لیکن یہ مشابہت مجھے اچھی لگتی ہے۔

بس ایسے ہی محسوسات کے درمیان مجھے فیضؔ کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا:

پیاری سرفراز

کل صوفیہ (بلغاریہ) سے واپسی پر بہت زمانہ کے بعد تمہارا خط ملا۔ ہم نے تو میناؔ کو تمہاری شکایت بھی لکھ بھیجی تھی کہ تم نے ہمارے خطوں کی رسید نہیں دی۔ خیر اب شکایت دور ہوگئی۔ اگرچہ ابھی دو خط تم پر قرض ہیں۔ تم نے کسی فضول آدمی کی باتوں کا رونا رویا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسی باتیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اب تک تمہارے قصے کہانیوں کا دور تو ختم ہو چکا ہوگا اب کوئی کیا باتیں بنائے گا۔ لیکن "خوئے بد" کا تو کوئی علاج اگر ہے تو یہی کہ آدمی نوٹس ہی نہ لے۔ اور تم نے جو ہماری

شکایت لکھی ہے کہ ہم نے تمہاری عادتیں بگاڑ دی ہیں تو یہی شکایت یہاں تم سے بھی ہے اور اسی "بگاڑ" کی وجہ سے اپنا کمرہ اور اپنا بستر زیادہ یاد آتا ہے۔ ہم صوفیہ جانے سے پہلے ایلس کے ساتھ لندن چلے گئے تھے جہاں الطاف گوہر کے دفتر والوں نے ایک نیا LP[1] اور CASSETTE (فریدہ خانم، اقبال بانو وغیرہ کا گایا ہوا) ریلیز کرنے کے لئے بہت بڑی تقریب کی تھی۔ ایلس کو ہم لندن چھوڑ آئے تھے اور طے کیا تھا کہ ایک ساتھ بیروت واپس پہنچیں گے لیکن مجھے تین چار دن پہلے آنا پڑا اور وہ ابھی لندن ہی میں ہیں۔ اب اکیلے رہ کر پتہ چلا کہ تم جیسی خواتین نے ہم کو کیسا اپاہج بنا دیا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا جانتے ہی نہیں۔ بس اتنا ہوا ہے کہ چائے بنانا اور انڈہ ابالنا سیکھ لیا ہے، باقی ہوٹل والوں کی مہربانی۔ اس سے زیادہ سیکھنے کا ارادہ نہیں ہے کہ کل کو گھر لوٹ گئے تو یہ محنت بیکار جائے گی۔

صوفیہ میں آسٹریلیا کے ایک بڑے ادیب سے ملاقات ہوئی تھی جو ہمارے پرانے دوست ہیں، انہیں مینا کا پتہ لکھوا دیا تھا۔ ان کا وعدہ ہے کہ واپس پہنچ کر اس سے رابطہ کریں گے۔

ہم شاید اس ہفتہ کے آخر میں کینیڈا جائیں گے۔ فرصت ملی تو شاید امریکہ کا چکر بھی ہو جائے۔ مانو جب تک پہنچ جائے تو اس کا پتہ بھجوا دیں۔

CASSETTE کا وعدہ قائم ہے اور تمہاری چیز کا بھی، لیکن کوئی ادھر آنے والا ملے تو بھیجیں۔ یہاں کی ڈاک قابلِ اعتبار نہیں۔ فی الحال دو شعر اور سُن لو:

اپنے انعامِ حسُن کے بدلے — ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو — پھر کبھی صبر آزما لینا

بہت سا پیار

---

[1] لانگ پلے ریکارڈ

دن گزرتے رہے۔ اور یوں ایک صبح سورج طلوع ہوا تو اس کی پیشانی پر نیا سال لکھا ہوا تھا۔ میں حیران رہ گئی کہ وقت کس قدر تیزی سے گزر جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ساحلوں پہ لہروں کے ساتھ آنے والی ریت مٹھی سے نکل جاتی ہے۔ شاید یہ میرا احساس ہے یا واقعی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات وقت یوں رُک جاتا ہے۔ جیسے آسمان صدیوں سے انسانوں کے سروں پہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اور کبھی یہ وقت اتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے جیسے کسی بچّے کا قہقہہ۔ بیتے دنوں سے مکالمہ کرنا مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے انسان شام کے وقت کسی پرانے سکول کی ویران عمارت میں چلا جائے اور وہاں اس کو اس کا بچپن کسی برآمدے کے ٹھنڈے فرش پہ سویا ہوا مل جائے۔ اب اس سے بات کی جائے یا اس کو دیکھا جائے۔

نیا سال ــــ ہمیشہ کی طرح روشن اور اس کی دھوپ ازلی تپش میں نہائی ہوئی تھی۔ درخت، فرش، پھُول، راستے، فضا، آوازیں، خوشبو ــــ غرض سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے اندر کہیں دُور اُداسی اپنے بال کھولے سو رہی تھی۔ ایسے میں نہ جانے کن خیالات میں گُم میں نے ایک کارڈ خریدا اور فیض صاحب کو روانہ کر دیا۔

اُنہوں نے اس کا یہ جواب لکھا:

پیاری سرفراز

آج لندن سے واپسی پر تمہارا اُداس کارڈ ملا۔ جدائی ہم نے بھی بہت برداشت کی ہے لیکن "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز"۔ ہم دو تین ہفتے میں گھر پہنچنے والے ہیں۔ باقی سب باتیں وہیں مل کر ہوں گی۔

بہت سا پیار

فیضؔ

بظاہر یہ چند سطروں کا خط بڑا ہی مختصر تھا لیکن میں اس مختصر سے سمندر میں کتنی ہی

دیر تک ڈوبی رہی۔ مجھے خود پر ایک ایسے جزیرے کا گمان ہونے لگا جو سمندر میں موجود تو ہوتا ہے مگر ہر بار چاند کی چودھویں رات کو یہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اس جزیرہ کا کوئی نام نہیں ہوتا، کسی نقشہ پر اس کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ یہ جزیرہ تو بس سمندر سے وابستہ ہوتا ہے۔ فیض صاحب کا یہ خط میں نے کئی بار پڑھا۔ اس خط نے مجھے ایک عجیب سی اور بے نام سی توانائی دی۔ جیسے کوئی تھکا ہارا ہوا ملاح اپنے بادبان سے بدگمان ہو کر کچھ دیر آنکھیں موندھ کر بیٹھ جائے اور اچانک آنکھیں کھولے تو اس کے سر کے اوپر سفید پرندے شر سیر انداز ہیں، ہواؤں میں غوطے لگاتے نظر آئیں۔ گویا ملاح کو احساس دلا رہے ہوں کہ کنارا نزدیک ہے — اگر ہم یہاں تک اُڑ آئے ہیں تو تم بھی وہاں تک پہنچ ہی سکتے ہو۔

اس طرح کی کیفیت میں مجھے خود پر پیار بھی آتا تھا اور غصہ بھی، پیار یوں کہ فیض صاحب مجھے یوں مخاطب کرتے تھے اور غصہ اس طور کہ وہ ایسا ہر بار کیوں نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جزیروں کو سمندر سے ہمیشہ ہی شکایتیں رہتی ہیں۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک بار فیض صاحب سے کہا تھا آپ اپنی یادداشتیں مرتب کریں۔ جواب ملا: اس کی کیا ضرورت ہے ہمیں؟

'آپ کو نہیں — ہمیں ہے' — میں نے سمجھایا۔

اچھا بھئی — دیکھیں گے!

کب دیکھیں گے؟

یہ تو معلوم نہیں ہمیں —

مگر مجھے معلوم ہے۔

تو ٹھیک ہے، پھر پوچھتی کیوں ہو؟

او ہو — فیض صاحب آپ میری بات مان کیوں نہیں جاتے؟

مان ہی تو جاتے ہیں۔

تو پھر ٹھیک ہے، آپ اپنی یادداشتیں ترتیب دیں۔

ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بھئی۔

کب شروع کریں گے یہ کام؟

ہم تو کوئی کام شروع نہیں کرتے — کام خود شروع ہو جاتا ہے۔

نہیں یہ کام آپ کو شروع کرنا پڑے گا۔

اچھا تو پھر — ہماری طرف سے تم شروع کر لو۔

یوں میں نے فیض صاحب کی یادداشتیں مرتب کرنا شروع کر دیں — مرتب تو خیر کیا کرنا تھیں، پہلا مرحلہ تو ان کو اِدھر اُدھر سے یکجا کرنے کا تھا۔ اس میں مرکزی کردار بھی فیض صاحب ہی کو ادا کرنا تھا۔ اور وہ فیض صاحب ہی کیا جو یوں بچے ہوتے سنگ سمیٹ لیتے، وہ تو تنِ داغ داغ لٹانے کے قائل تھے۔ اسی حوالے سے انہوں نے ایک خط میں لکھا:

پیاری سرفراز

تمہارا خط کچھ دن پہلے ملا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہم آٹھ دس دن کے لئے برلن چلے گئے، یہاں سے پچھلے ہفتے واپسی ہوئی۔ شاید تھوڑے دنوں کے بعد کہیں اور جانا ہو۔ ہر خط کا حساب رکھنا ضروری نہیں، اس لئے جب تمہارا جی چاہے لکھ دیا کرو۔ مینا کا ایک خط بھی بہت دیر سے آیا رکھا ہے۔ آج اسے بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ مارچ کا مہینہ ہمیں کچھ راس نہیں آتا۔ اسی مہینے جیل خانے گئے، پھر انہی دنوں میں وطن بدر ہوئے۔ خدا کرے اب کے خیریت سے گزر جائے۔ ویسے تو دن یہاں آرام سے گزر رہے ہیں لیکن جیسا کہ کبھی لکھا تھا:

یادوں کے گریبانوں کے رفو پر
دل کی گزر کب ہوتی ہے۔

لیکن اب تو اسی سہارے پہ گذر ہو رہی ہے، یا پھر اس تسلّی پر کہ "لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے"۔ البتّہ اب عمر اتنی ہو گئی ہے کہ کبھی کبھی اس شام کی لمبائی سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے لیکن ہم اس بارے میں بہت کم سوچتے ہیں۔

ماتو اب غالباً اپنے نئے گھر پہنچ گئی ہوں گی۔ تمہاری سیر پھر کب شروع ہو گی۔ اب یہاں جنگ اخبار باقاعدگی سے ملنے لگا ہے لیکن اس میں دل کو خوش کرنے کا سامان کم ہی نظر آتا ہے۔ سنا تھا تم نے بھی اخبار نویسی شروع کر دی ہے لیکن ابھی تک تو کچھ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہت دنوں سے اپنا دماغ بھی غیر حاضر ہے اور کچھ لکھا نہیں گیا۔ جب کبھی کچھ وارد ہوا تمہیں لکھ بھیجیں گے۔

اقبال کی صحت اب کیسی ہے؟

بہت سا پیار

فیض

بعض اوقات ایسے واقعات رُونما ہو جاتے ہیں جن کا انسان تصوّر بھی نہیں کرتا۔ کچھ ایسا ہی واقعہ غالباً مئی ۱۹۸۱ء میں ہمارے یہاں بھی ہوا۔ میرا بیٹا دیمی (ندیم) طبعاً نرم خو اور حسّاس واقع ہوا ہے۔ اس سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ڈاکٹر بنا اور اُس نے اس پیشے کے تقاضوں کو خدا کے فضل و کرم سے بڑی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تقرّری راولپنڈی کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال تک مسلسل رات کی ڈیوٹی کرتا رہا۔ وہ معلوم نہیں رات کے کون سے پہر واپس آ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ دن میں ڈیوٹی لگوا لو۔ لیکن وہ ہر بار یہی جواب دیتا: میرا کام ڈیوٹی لگوانا نہیں، ڈیوٹی انجام دینا ہے۔ اس کے دوستوں نے دیکھتے ہی دیکھتے خوشحالی کی کئی منزلیں طے کر لیں مگر وہ قناعت اور خدمت کے راستے پر

خاموشی سے چلتا رہا۔ اب وہ امریکہ میں ہے مگر اس نے اپنی روش اور مسلک نہیں بدلا شاید اس لئے کہ سرشت بدلنا ممکن ہی نہیں۔ جن دنوں وہ میڈیکل کالج (R.M.C) میں زیر تعلیم تھا اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اپنے غریب دوست طلبا کی امداد کے لئے ایک تقریب کا انتظام کیا۔ وہاں اتفاق سے بعض ایسے منچلے اور اوباش نوجوان بھی آن دھمکے جن کی تعلیم تو ممکن ہے صحیح ہو مگر ان کی تربیت صحیح نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے تقریب میں موجود خواتین اور خصوصاً طالبات پر غیر شائستہ جملے کسنا شروع کر دیئے ڈیمی نے کچھ دیر تو یہ سب برداشت کیا مگر پھر اس سے یہ نہ ہو سکا۔ وہ اٹھا اور اس نے ان منچلوں کو اپنی حرکتوں سے باز رہنے کو کہا ـــــ بس پھر کیا تھا، وہ ڈیمی پر لپکے۔ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی، ڈیمی کے دوست بھی آن پہنچے۔ لیکن اس اثنا میں ایک ستمگر نے میرے کلیجے کے ٹکڑے پر چاقو سے وار کیا۔ ڈیمی نے اپنا بچاؤ کیا اور کچھ وار بھی کاری نہ تھا لہٰذا زندگی نے ڈیمی کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ پھر بھی اس کے کان پر خاصا زخم آیا۔ سعودی عرب سے واپسی پر میں نے ڈیمی کو اس حال میں دیکھا تو میری آنکھوں میں یکدم جیسے خلاؤں کا سناٹا اُتر آیا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین اپنا محور بدل رہی ہے یا کسی انجانی سمت میں گرنا شروع ہو گئی ہے۔

ان دنوں نے مجھے بہت پریشان رکھا لیکن خدا کا شکر ہے ڈیمی جلد صحت یاب ہونے لگا۔ اس کا ذکر میں نے فیضؔ صاحب کے نام اپنے خط میں کیا تو انہوں نے لکھا:

پیاری سرفراز

یہاں چار پانچ دن سے بالکل حشر بپا ہے۔ دفتر کے سب لوگ بھی غیر حاضر ہیں اور ہم اکیلے بیٹھے دھماکوں کی آوازیں سُن رہے ہیں۔ اچھا ہوا کہ تمہارا خط آ گیا۔ "جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا"۔ بہت دنوں سے ہم بھی لکھنے کا سوچ رہے تھے لیکن معلوم نہیں تھا کہ تم ہو کہاں؟

دیمی کا پڑھ کر بہت وحشت ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بلا ٹل گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہیں قتل و غارت کا میدان گرم ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی جان محفوظ نہیں اور وہ بھی بازاری غنڈوں کے سبب سے نہیں، پڑھے لکھے طلبار کے ہاتھوں، جو سب سے بڑھ چڑھ کر اسلامی نظام کی باتیں کرتے ہیں۔ دیمی کو ہماری طرف سے بہت سا پیار دینا۔

ہم تو اگلے ہفتے یہاں سے چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ اس نئی مصیبت کا علم نہیں تھا ورنہ پہلے نکل جاتے۔ اب دفتر میں کوئی لوٹے تو ہم کام کسی کے حوالے کریں۔ لندن اور امریکہ کی طرف سے دعوت ہے اسے نپٹا کر گھر آجائیں گے۔ اور بہتر ہے کہ تم بھی زیادہ وقت دیمی کے ساتھ گھر پر بیٹھو اور میاں کے لئے وہاں کسی "عربن"[1] کا انتظام کردو۔

نوبل پرائز کی خبریں لندن سے بھی آئی تھیں۔ یہ اعزاز تو ہمیں کون دے گا۔ اس کا اشتہار ہی سہی، کسی مہربان نے امیدواروں میں ہمارا بھی نام لکھوا دیا ہوگا۔ لندن پہنچ کر شاید ٹیلیفون پر تم سے بات ہو سکے یا شاید اس سے پہلے MEDICAL CHECK UP کے لئے ماسکو جانا ہو۔ اگلے دو چار دن میں اگر راستہ کھلا رہا تو انشاءاللہ روانگی ہو جائے گی اور جہاں کہیں بھی جانا ہوا تمہیں لکھ بھیجیں گے۔

خالد سعید بٹ کی امی کا ایلس کے خط سے معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے تعزیت کا خط بھی بھیج دیا تھا۔ امید ہے اسے مل گیا ہوگا۔

دو شعر بھی سُن لو:

باقی ہے کوئی ساتھ تو اب ایک اسی کا — پہلو میں لئے پھرتے ہیں جو درد کسی کا
اک عمر سے اس دُھن میں کہ ابھرے کوئی خورشید — بیٹھے ہیں سہارا لئے شمعِ سحری کا

بہت سا پیار

فیض

---

[1] ان دنوں میرے میاں سعودی عرب میں تھے لہٰذا عربن سے مراد فیض صاحب کی یہ تھی کہ کسی عرب خاتون کا انتظام کر دو۔

جیساکہ فیض صاحب کے خط ہی سے ظاہر ہے، یہ وہ دن تھے جب بیروت پر قیامت کے دن رات گزر رہے تھے۔ اسرائیل نے فلسطینیوں پر زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھام کر اقوامِ متحدہ میں تقریر کرنے کے لئے جانے والے یاسر عرفات کے ہاتھوں سے زیتون کی شاخ گر جائے گی اور وہ بندوق کی لبلبی پر اپنی انگلیوں کی گرفت بڑھا کر تاریخ کا نیا باب رقم کرے گا۔ صیہونیت نے انسانیت اور آدمیت کو داغدار کر دیا تھا اور وہ بیروت جو روشنیوں اور خوشبوؤں کا دوسرا نام تھا، آگ، دھوئیں اور بارود میں چھپ رہا تھا۔ فیض صاحب تو خیر بنفسِ نفیس وہاں موجود تھے۔ خود ہم لوگ ہزاروں میل دور بیٹھے بالکل ان کی طرح ہی سوچتے اور سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ایک نمایاں فرق تھا۔ فیض صاحب ڈٹے ہوئے تھے اور ہم سب سہمے ہوئے۔ شاید اسی لئے قدرت نے انہیں یاسر عرفات کا دستِ راست بنا دیا تھا اور ہمیں ان کا دعاگو رہنے پر مامور کر دیا تھا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ فیض صاحب نے محاورتاً نہیں حقیقتاً مجاہد کی زندگی بسر کی۔ اسلام دشمنوں کے روبرو اپنے مورچہ پر ڈٹے رہے۔ لوٹس LOTUS کے دفتر میں بیٹھ کر انہوں نے ساری انسانیت کی لاج رکھی اور سامراجیت کے تابوت میں اپنے حصّے کا کیل پوری دلیری کے ساتھ ٹھونکا۔

بیروت ہی سے فیض صاحب کا یہ خط مجھے کچھ عرصہ کے بعد موصول ہوا:

پیاری سرفراز

یا تو ہفتوں تمہاری خبر نہیں آتی یا اب سفر سے لوٹتے ہی تمہارے دو خط ایک ساتھ ملے اور ایک سفر پہ روانگی سے پہلے بھی ملا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ ضرور کسی نے تنگ کیا ہوگا۔ اگرچہ وہاں کے ایک انگریزی میگزین CANDID[1] میں جو تمہاری

---

[1] مستنصر جاوید کی ادارت میں نکلنے والا اسلام آباد کا پہلا انگریزی ماہنامہ CANDID

تصویر کل نظر آئی (غلام رسول[1] کی نمائش کا فیچر ہے) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ روز روز ترقی پر حسن"۔ تم نے اپنی دوستیوں اور ہرجائی پن کا ذکر کیا ہے۔ اس پر تو ہمیں کیا اعتراض ہو گا لیکن غلط قسم کے دوست چننے میں جو تمہیں مہارت حاصل ہے اس کا کچھ علاج ضرور ہونا چاہیئے۔ مسکرا کر خیر مقدم کرنے تک تو ٹھیک ہے لیکن اگر مسکرانے کا انداز ہی ایسا ہو کہ یو پی والوں کی زبان میں کسی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں تو اس میں کسی کی کیا خطا۔ اس کے جواب میں تم کہو گی کہ ہم کیا کریں، ہماری صورت ہی ایسی ہے، تو وہ بات بھی ٹھیک ہے۔

لندن میں میزو سے بات ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں اور مانو کو بچی عطا ہوئی ہے۔ مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے لئے ایک GRAND MOTHER کا بیج بنوا لو جو بوقتِ ضرورت سامنے لگا لیا کرو۔ لیکن خیر نانی پن سے تم میں کیا ہی فرق آئے گا البتہ ہم اب واقعی ریٹائر ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا۔ ایلس نے تو اکتوبر نومبر میں گھر واپس لوٹنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ اپنا ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہے لیکن نئے سال کے شروع میں ایک چکر تو ادھر کا ضرور کریں گے۔ تمہارا اگر باہر نکلنے کا ارادہ ہو تو کم از کم ایک مہینہ پہلے ہمیں ضرور بتا دینا۔ اکتوبر نومبر میں شاید ہم غیر حاضر ہوں۔ اگر اگست میں ہمارا امریکہ جانے کا پروگرام طے ہو گیا تو تم بھی مانو سے ملنے کی صورت کر لینا ورنہ پھر سہی۔

مینا کا خط آیا ہے، خوش معلوم ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ اب تو اس کا نسرلورڈ بھی وہاں نہیں ہے، خوب مزے کر رہی ہوں گی۔ لیکن تم نے تو سب اداسی کی باتیں لکھی ہیں۔ "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" — پھر ہم وہاں پہنچ کر سب

---

[1] مصور غلام رسول

کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ میر[1] صاحب کو سلام پہنچا دیجئے۔ اب تو ہمارے ایک دوست نیاز محمد ارباب بھی جو راولپنڈی "سازش" میں ہمارے ساتھ قید تھے وہاں کلچر کے وزیر بن کر آگئے ہیں۔ سنا ہے خالد سعید بٹ کے 'باس' ہیں۔ کچھ ڈر لگنے لگا ہے کہ ہم گھر پہنچے تو ہمیں بھی کوئی کرسی پر نہ بٹھا دے۔

دو شعر بھی سن لو، اور رونا دھونا بند کرو۔

اپنے انعامِ حُسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

بہت سا پیار

لندن سے ایک تراشہ آیا تھا، جو ملفوف ہے۔

فیض صاحب اس کے بعد پھر نئے سفر پر چل نکلے، اور میرے خط ان کی تلاش میں۔ میرے دل میں بس یہی خیال دعا بن کر آتا تھا کہ وہ خیریت سے ہوں — کیونکہ بیروت تو اب آتش فشاں کا روپ دھار گیا تھا۔ وہ میری اداسیوں کی بات کرتے تھے مگر میری اداسیوں میں تو بیروت سے آنے والی خبروں کے ساتھ ہی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا کہ اخبار دیکھتی اور اس میں بیروت میں پھیلے ہوئے بارود کی بو محسوس نہ ہوتی یا کسی خبر کے لفظوں سے لہو رِستا ہوا دکھائی نہ دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے میری بیٹی مانو کو ایک خط لکھا جو یہ تھا:

پیاری مانو

تمہارا خط کینیڈا اور امریکہ سے واپسی پہ ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ تمہارا خط وہاں

---

[1] میر علی احمد تالپور، جو ان دنوں وزیر دفاع تھے۔

جانے سے پہلے مل جاتا تو شاید ملاقات بھی ہو جاتی، اس لئے کہ واشنگٹن کہیں تمہارے آس پاس ہی ہوگا۔ ورنہ ٹیلیفون پر تو ضرور ہی ملاقات ہو جاتی۔ خیر۔ شاید اگلے سال پھر آنا ہو تو ضرور مل لیں گے۔ کینیڈا میں ٹورنٹو، کنگسٹن، آٹوا کا دورہ کیا، اور امریکہ میں ہارورڈ، مشی گن اور واشنگٹن جانا ہوا۔ غرض بہت بھاگ دوڑ رہی، کچھ لیکچر دیئے، کچھ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ کافی مشقت کرنا پڑی لیکن کچھ لطف بھی آیا اس لئے کہ بیروت میں تو ہم زیادہ وقت گھر میں بند رہتے ہیں اور دو چار کے علاوہ کوئی ملنے والا بھی نہیں، البتہ فرصت بہت ہے۔

اگلے مہینے ایلس پاکستان جائیں گی۔ اگر حالات ٹھیک رہے تو شاید ہم بھی ایک چکر لگا آئیں۔ اب تو گھر سے نکلے ہوئے کافی زمانہ ہو گیا اور اپنے لوگوں کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

تمہیں امریکہ کیسا لگا، گھر کیسا ہے اور تم نے ڈاکٹری شروع کر دی ہے یا نہیں؟ بہت دنوں سے تمہاری امی کا خط نہیں آیا۔ تم اگلے سال انہیں اپنے ہاں بلا لو تو شاید ہم بھی آجائیں۔ تمہارے میاں سے ملاقات ابھی باقی ہے۔

بہت سا پیار

انکل

اس خط سے بھی صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ فیضؔ صاحب وطن اور اہلِ وطن کے لئے کتنے بے چین تھے۔ ان کے ذہن پر دیس کی یادوں کا گہرا اثر تھا اور میں تو یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس عرصہ میں انہوں نے جو شعر کہے، اس میں ہمیشہ کی طرح ان کا محبوب — یہی سوہنی دھرتی رہا۔ ان کے دل میں اس محبوب وطن کے لئے عشق اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ ساری دنیا گھومتے رہے لیکن کسی جگہ بھی ان کا جی مطمئن نہ ہو سکا۔ وہ اس بات پر کیسے بے کل اور بے چین ہو جاتے تھے کہ "اب تو گھر سے نکلے ہوئے کافی زمانہ ہو گیا۔ کیا معلوم

کہ ان دنوں فیض صاحب نے ہماری گلیوں، کوچوں، آبادیوں، چہروں، پرندوں، موسموں اور رُتوں کو کس کس رُخ سے کتنی شدت سے یاد کیا ہوگا۔ اور اس ملال نے ان کے معصوم دل پر کتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے۔ جو لوگ ان کو اس "جلاوطنی" میں ملے وہ جانتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فیض صاحب پاکستان سے آنے والوں سے خوب تپاک سے ملتے۔ یوں جیسے سارے پاکستان کو گلے لگا رہے ہوں۔ وہ خاموش بیٹھ کر دیس سے آنے والے کی باتیں سنتے۔ بظاہر وہ سگریٹ پھونکتے جاتے تھے لیکن درحقیقت یہ ان کے اندر اُٹھنے والے بے چین جذبوں کا غیر شعوری اظہار ہوا کرتا تھا۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتے مگر ان کی چمکتی ہوئی عقابی آنکھوں اور سوچتی ہوئی گوتمی مسکراہٹ میں ان کا سارا شوقِ سماعت سمٹ آتا اور وہ اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کہتے: بھئی — اور تو سب ٹھیک ہیں — ناں؟

اس کے کچھ عرصہ کے بعد فیض صاحب کا ایک کارڈ مجھے ملا۔ لکھا تھا:

پیاری سرفرانہ اور بچو

ہمارا سفر کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا ہے لیکن غالباً آخری منزل ہے اور آئندہ ماہ تک شاید واپسی ہو جائے۔ آپ لوگوں کی ایک زمانے سے کوئی خبر نہیں آئی اگر ممکن ہو تو اس پتہ پر دو حرف لکھ دینا۔ نیا سال مبارک اور بہت سا پیار

فیض

C/O MRS. COLIVER

ASIA FOUNDATION

550 STREET

SAN FRANCISCO

اب ہم فیض صاحب کو کیسے بتاتے کہ:

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ دوستی، محبّت، عشق، چاہت ـــــ یہ سب کیا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی سمجھ نہیں آسکی۔ ممکن ہے بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصوّر کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ ـــــ کاش کبھی مجسّم ہو کر مجھے ملنے آئیں، میں انہیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھادوں اور پھر ان کی باتیں سنوں ـــــ سنتی جاؤں ـــــ سنتی ہی جاؤں ـــــ حتّٰی کہ سننے اور سنانے کے لئے کچھ باقی نہ رہے ـــــ آوازیں ختم ہو جائیں ـــــ کمرہ خالی رہ جائے۔

ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے میں نے فیضؔ صاحب کو ایک خط لکھا جس کا جواب میری توقع کے مطابق نہیں آیا تھا۔ میں نے ایسی ہی باتوں سے باتیں کرنا شروع کردیں لیکن ابھی کمرہ خالی نہیں ہوا تھا کہ اچانک فیضؔ صاحب کا خط آگیا ـــــ لکھا تھا:

پیاری سرفراز

یہ سال اس لحاظ سے تو اچھا شروع ہوا ہے کہ دو دن پہلے آخر تمہارا خط آہی گیا۔

کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا: ـــــ

"کس قدر ہوگا یہاں مہر و وفا کا ماتم — ہم تری یاد سے جس روز اُتر جائیں گے"

اور تمہاری طویل خاموشی سے شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید یہ ہو بھی چکا ہے۔ ایک دو بار تمہیں لکھنے کا خیال بھی کیا لیکن کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ تم ہو کہاں؟ ماتو سے بھی لکھ کر پوچھا کہ تمہاری امی کہاں غائب ہو گئیں؟ اس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید ہماری طرح وہ بھی تم سے روٹھی بیٹھی ہے۔

اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اوّل تو دو تین ہفتے پہلے ہماری بہت بڑھیا سیکرٹری جو ایلیس کے بعد ہماری دیکھ بھال کر لیا کرتی تھی اچانک ہمیں طلاق دے کر امریکہ

سدھار گئی اور دوسرے یہ کہ تین چار ہفتے سے گھر والوں کی بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ تار کا بھی جواب نہیں آیا۔ اتنی وحشت ہوئی کہ سوچا کم از کم بیروت سے کہیں بھاگ چلیں شاید کچھ دل بہل جائے چنانچہ دو دن پہلے یہاں کا ٹکٹ کٹوایا اور روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا کہ یکبارگی تین خط ایلس اور تمہارا خط ایک ساتھ پہنچے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ یہاں آنا بھی غارت ہو جاتا۔ یہاں آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس سائپرس کا نام بہت سن رکھا تھا۔ سوچا دیکھتے چلیں، ویسے کوئی خاص دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ سمندر کے کنارے LIMASOL شہر کے جس ہوٹل میں ڈیڑھ دن گزرا خاصی بڑھیا جگہ تھی۔ پھر یہاں نکوسیا میں جو صدر مقام ہے PLO کے نمائندہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ جبراً اپنے گھر لے آئے۔ یہ شہر تو ویسا ہی ہے جیسے سب مغربی بڑے شہر ہوتے ہیں لیکن ہمارے میزبان (غیر شادی شدہ) بہت مزے کے آدمی ہیں۔

تمہارا پروگرام گڑبڑ ہو جانے کا افسوس ہے۔ اپنے پاس وقت اتنا کم رہ گیا ہے کہ نہ جانے پھر موقع ملے یا نہ ملے، لیکن خیر خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہارے نوسو تو پورے ہو گئے۔ اب اگلے نوسو پورے ہونے تک تمہیں کافی لمبی چھٹی ہے۔ ہمارے اتفاقاً کراچی رُک جانے کا کچھ حال تم نے سن لیا ہوگا۔ وہاں اور دوستوں کے علاوہ فراز سے بھی ملاقات ہو گئی۔ (نوسو والا فقرہ دراصل اُسی کا ہے) بی بی سی والوں نے معلوم نہیں کس رنگ میں ہمارے کراچی رُکنے کی خبر نشر کی کہ دنیا بھر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ خاص طور سے بیروت کے سب اخبارات اور PLO کے دفتر نے تو اتنا ہنگامہ کیا کہ حد نہیں۔ یہ ہمیں جاپان سے واپسی پر پتہ چلا جب بات پُرامن ہو چکی تھی ورنہ ہم تردید کر دیتے۔

اب اپنا پروگرام یہ ہے کہ یہاں سے لوٹ کر ہم دو ہفتے کے لئے کام سے

لندن جائیں گے اور پھر انشاءاللہ جنوری کے آخر یا فروری کے شروع میں کوئی مہینے بھر کے لئے پاکستان کی ہوا کھائیں گے۔ غالباً پنڈی اسلام آباد میں آنا ہوگا ورنہ تم لاہور آجانا۔

پچھلے دنوں تنگ آکر یہ شعر لکھے تھے:

آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر تیرے خیال کے پھول
ترکِ اُلفت کے دشت سے چُن کر
آشنائی کے ماہ وسال کے پھول
تیری دہلیز پہ سجا آئے
پھر تیری یاد پہ چڑھا آئے
باندھ کر آرزو کے پلّے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

ڈیمی، غالب اور مینا کو پیار۔ اور ظاہر ہے کہ تمہیں بھی۔

فقط

فیض صاحب نے اس خط میں "نوسو" کا شگفتہ اشارہ دراصل میرے دوسری بار حج کرنے کے حوالے سے انتہائی مزاحیہ پس منظر میں کیا ہے۔ اور کراچی میں فیض صاحب کے رُکنے کا احوال یوں تھا کہ وہ جاپان کے لئے جاتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈے پر ٹرانزٹ میں تھے، کچھ دیر کے بعد ان کی فلائیٹ روانہ ہونے والی تھی مگر وہ وطن کی ہواؤں اور چہروں میں کچھ ایسے گم ہوئے کہ بالکل بے دھیانی میں "ٹرانزٹ ہال" سے باہر نکل گئے اور جب واپس اندر داخل ہونے لگے تو انہیں اس کی اجازت نہ دی گئی۔ فیض صاحب کی فقیر طبیعت نے یہ تکلف ہی نہ کیا تھا کہ جاتے ہوئے کسی متعلقہ شخص کو احتیاطاً مطلع کر جاتے

یا ڈیوٹی پر موجود حکام سے کوئی ٹوکن وغیرہ حاصل کر لیتے۔

اُدھر فلائیٹ تیار کھڑی تھی جس پر فیض صاحب کا سامان لد چکا تھا اور اِدھر فیض صاحب کو ضابطوں اور قواعد نے گھیر رکھا تھا۔ بالآخر فیض صاحب کو ایک ترکیب سُوجھی، انہوں نے ایئر پورٹ سے ہی میر علی احمد تالپور کو کسی نہ کسی طرح فون کیا اور سارا مسئلہ کہہ سنایا۔ تالپور (مرحوم)، نے فوراً مداخلت کی اور معاملہ طے ہو گیا۔ مگر اس اثنا میں فلائیٹ نکل چکی تھی۔ طے پایا کہ فیض صاحب آئندہ فلائیٹ سے جو جلد ہی جا رہی تھی، روانہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن اس واقعہ کو طرح طرح کے مفہوم دیئے گئے۔ بی بی سی نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ فیض کو حراست میں لے لیا گیا لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔

ادھر بیروت میں آگ و خون کا جو بازار ایک عرصہ سے گرم تھا اور جس کے بارے میں بھی فیض صاحب گاہے بگاہے لکھتے رہتے تھے، اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ روشنیوں اور رنگوں کا شہر بیروت بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑ رہا تھا اس میں اپنوں نے غیروں کا کردار کیونکر ادا کیا، اس عنوان سے کچھ سپردِ قلم کرنے کا مجھے حوصلہ اور یارا نہیں۔ (یہ مؤرخ کا منصب ہے) مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہر فلسطینی کو بیروت سے نکلتے ہوئے حسین کا قافلہ ضرور یاد آیا ہو گا۔

مجھے فیض صاحب کے بارے میں بہت زیادہ تشویش تھی اور اس کا ایک جواز بھی تھا۔ وہ یہ کہ فیض صاحب یاسر عرفات کے انتہائی قریبی اور قابلِ اعتماد ساتھی تھے بھلا یہودی ان کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے فیض صاحب اور یاسر عرفات کا دفتر ایک ہی عمارت میں تھے جو خبروں کے مطابق گولہ باری کا نشانہ بن چکی تھی۔ ہر طریقہ سے فیض صاحب کی خیریت معلوم کرنا چاہی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بار بار شدت سے خیال آتا تھا کہ فیض صاحب ہجرت در ہجرت کے عذاب کیسے جھیل رہے ہوں گے۔ دمشق سے اچانک فیض صاحب کا یہ خط ملا:

پیاری سرفراز

تمہیں یہ خط لکھ کر رکھا ہی تھا کہ شہر میں قیامت آگئی۔ ایئر پورٹ، ڈاک، تار، ٹیلیفون

—سب کچھ بند، گھنٹے دو گھنٹے کے علاوہ بجلی اور پانی بھی غائب۔ ہم چھٹی منزل پر تھے۔ اس لئے لفٹ بند ہو جانے سے باہر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ دو تین دن کے بعد میگزین میں ہمارے ایک رفیق کار فلسطینی شاعر اپنی عمارت میں لے گئے اور کم از کم تنہائی اور فاقہ کشی سے کچھ نجات ملی۔ اور پھر

ایک پاکستانی ملنے والے جو اپنے خاندان کے ساتھ U.N.O کی حفاظت میں سفر کر رہے تھے، کسی طرح ہمیں بھی اپنے خاندان میں شامل کر کے یہاں لے آئے۔ باقی جو کچھ گزری کبھی زبانی بتائیں گے۔ کل ہسپتال میں داخلہ کے لئے ماسکو روانگی ہے۔ اور پھر وہاں سے لندن ہوتے ہوئے گھر —— یہ خط تمہیں ملے تو ہمیں لندن کے پتہ پر کچھ لکھ دینا۔ بہت سا پیار

C/O MRS. AFZAL

32 CHURCH CRESEANT

MUSWELL HILL

LONDON NO:10

اس کے بعد جب فیضؔ صاحب واپس پاکستان آئے تو بس یوں محسوس ہوا:

ع جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

لیکن ایک عجیب بات ہوئی۔ فیضؔ صاحب میرے گھر آکر ٹھہرے۔ مجھے جلد ہی احساس ہوا کہ لوگ "بوجوہ" فیضؔ صاحب کے ساتھ ملاقات سے گریزاں ہیں، حالانکہ خود فیضؔ صاحب نے کبھی اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ وہ تو خود اپنی ذات میں گم تھے —سمندر کی طرح—! لیکن مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ آخر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن پھر ایک واقعہ نے سارے ماحول کو بدل دیا۔ سکوت ٹوٹ گیا اور فیضؔ ایک بار پھر چاہنے والوں کی یلغار میں تھے۔

ہوا یوں کہ فیض صاحب صدر محمد ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ ان سے مل کر براہ راست تبادلہ خیال کر لیں۔ وہ دراصل یہ نہیں چاہتے تھے کہ خواہ مخواہ غیر ضروری غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ یہ ملاقات انتہائی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ صدر نے فیض صاحب کو نہایت عزت و احترام سے وقت دیا اور فیض صاحب اس پر مطمئن تھے۔ وہ میرے گھر سے ہی صدر ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے تھے اور اس ملاقات کا میرے سوا بمشکل تین چار اور لوگوں کو علم تھا۔

میں اس وقت اس ملاقات کی اہمیت سے بے خبر تھی یا یوں کہہ لیں کہ مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ اچانک رات کو جنگ سے ایک رپورٹر کا فون آیا اور اس نے فیض صاحب کا پوچھا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں کہہ دیا: وہ تو پریزیڈنٹ سے ملنے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ رپورٹر چونک اٹھا اور مجھ سے میری بات کی مکرر تصدیق چاہی، میں نے کہا: میں نے جو بتایا وہ بالکل سچ ہے اور میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہی ہوں —— اور یوں دوسرے دن کے اخبار میں فیض صاحب کی صدر ضیاء الحق سے ملاقات کی خبر چھپ گئی۔

اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ لوگ برسات کے مینڈکوں کی طرح فیض صاحب کے دیدار کو نکل آئے۔ میرے گھر کے لان میں "فیض پسندوں" نے ڈیرے جمائے، معلوم نہیں کون کب آتا اور کب چلا جاتا۔ میں مہمان نوازی میں اتنی الجھی کہ فیض صاحب کے آرام کا بھی خیال بعض اوقات ذہن سے نکل جاتا۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا تھا کہ صدر ضیاء نے فیض صاحب کو کیا کہا ہے۔ اور جب فیض سے پوچھا جاتا تو وہ کہتے: بھئی اب تو یاد نہیں —— ویسے کوئی خاص بات تو تھی نہیں۔

ایسی ہی محفلوں کو دیکھ کر میری بیٹی نے کہا: ماں یوں لگتا ہے جیسے ہمارا گھر شادی والا گھر ہو۔ ایسی ہی محفلوں میں سے ایک میں فیض صاحب نے بیروت سے ہجرت کا حال سنایا۔ کہنے لگے: جب ہمارے دوست ہمیں اپنی U.N.O والی گاڑی میں بٹھا کر شام کی سرحد

پر پہنچے تو اسرائیلیوں نے روک لیا۔ ان کے بیوی بچوں کے پاس تو بیروت سے نکلنے کے لئے لبنان کے پاسپورٹ اور کاغذات تھے۔ جب ہمارے بارے میں پوچھا گیا تو ہم خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے تسلّی سے اخبار پڑھتے رہے۔ ہمارے دوست نے اسرائیلیوں سے کہا: یہ میرے بچوں کے نانا ہیں ـــــ اور یوں ہم دمشق جا پہنچے۔

ان محفلوں کو اداس کر کے فیض صاحب کراچی چلے گئے جہاں ان کی طبیعت سخت خراب ہو گئی اور مارچ میں وہاں سے ماسکو چلے گئے۔

ماسکو سے فیض صاحب نے ایک خط لکھا جس سے ان کی شخصیت کے کئی گوشے اجاگر ہوتے محسوس ہوتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سات رنگین دروازوں کے دوسری طرف ایک ایک ہی روشنی ہے مگر دروازے سے اس طرف اس کے رنگ مختلف ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

پیاری سرفراز

شاید تمہیں پہلے بھی کبھی لکھا تھا کہ اگر ہم خط نہ لکھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یاد بھی نہیں کرتے۔ بلکہ جتنا زیادہ یاد کرو اتنا ہی خط لکھنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے لیکن اب کے تو ہمارے پاس ایک بہانہ بھی ہے اور وہ یہ کہ جب سے پاکستان واپسی ہوئی ایک بیماری کے بعد دوسری کا ایسا تانتا لگا ہے کہ چھٹکارا ہی نہیں ملا۔ میو ہسپتال میں جیسی اذیت سے گزرے اس کا سامنا تو نہیں ہوا لیکن کراچی پہنچتے ہی بخار نے آلیا اور ہفتہ بھر لٹائے رکھا۔ ڈاکٹروں نے کبھی کوئی مرض کہا اور کبھی کسی INFECTION کا نام لیا۔ خیر بخار سے جان چھوٹی تو اس سے اگلے ہفتے یہاں پہنچے۔ خیال تھا کہ ایک دو دن میں اس آرام دہ ہسپتال میں داخلہ مل جائے گا جو ایک طرح کا سینی ٹوریم بھی ہے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ رات کو بائیں جانب پسلیوں کے نیچے درد اٹھا خیال تھا کہ ایسے ہی کچھ ہو گا اور کوئی ڈاکٹر دیکھ کر نسخہ لکھ دے گا لیکن اپنی مترجم سے ذکر کیا

تو وہ گاڑی میں بٹھا کر شہر کے ایک بڑے ہسپتال میں چھوڑ آئیں۔ شام سے لے کر رات کے دو بجے تک ایک TEST کے بعد دوسرا ٹسٹ، جس میں پیٹ میں شگاف کر کے اندرونی اعضاء کا معائنہ بھی شامل تھا۔ پہلے سننے میں آیا شاید اپریشن کی ضرورت پڑے، پھر کہا نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہفتے کے بعد چھٹی ملی تو جان میں جان آئی لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔ اب ہم اس ہسپتال کے POLYCLINIC میں ابتدائی معائنے کے لئے گئے تو وہاں کی خوش شکل ڈاکٹرنی نے جب سب کچھ ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تو کہا تمہاری آنکھوں کا رنگ کچھ اچھا نہیں ہے، مجھے یرقان کا شبہ ہے۔ کل خون کا پھر ٹسٹ ہوگا۔ اگلے دن خون کا ٹسٹ ہوا تو کہنے لگے یرقان ہے۔ بس پھر کیا تھا بالکل قیامت برپا ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے یہاں یرقان کو پلیگ یا ہیضے سے ذرا ہی کم مقام حاصل ہے۔ فوراً ایمبولینس آئی۔ ہوٹل کے کمرے کو خالی کرنے کا حکم ہوا اور ہمیں اس ہسپتال کے QUARANTINE میں نظر بند کر دیا گیا۔ ہفتے بھر کے بعد طے ہوا کہ یرقان نہیں ہے اور پھر اس ہسپتال میں آنے کی اجازت ملی۔ یہاں وسیع باغ ہے، جھیل ہے۔ بات کرنے کو کافی لوگ ہیں۔ غرض بہت آرام ہے اور باقی مہینہ یہیں پر گزرے گا۔ اس کے بعد کا پروگرام ابھی طے نہیں کیا۔ غالباً LOTUS میگزین کے سلسلے میں تیونس جانا ہوگا۔ پھر لندن کا ایک چکر لگا کر گھر آجائیں گے۔ کراچی سے روانگی سے پہلے تمہاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمہارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا۔ ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تاکہ سند رہے اور تم بھاگ نہ سکو۔ جدائی کا دُکھ تو ہے لیکن حدیث شریف ہے کہ کم کم ملا کرو تاکہ محبت میں اضافہ ہوتا رہے۔ ہمارا کم کچھ زیادہ ہی ہو چلا ہے لیکن "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز"۔ میو ہسپتال میں رات کو بے خودی کے عالم اور آکسیجن TENT کی گرفت میں کچھ تک بندی کی تھی جو افکار[1] میں کچھ غلط چھپی ہے۔ ممکن ہے کہیں اور

---

[1] ممتاز ادبی پرچہ 'افکار' ۔ ایڈیٹر: صہبا لکھنوی

بھی غلط نقل کی گئی ہو، اس لئے سن لو:

اب تو لگتا ہے کہیں، کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچے میں کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
شاید وہ کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اب بیر نہ الفت نہ کوئی ربط نہ رشتہ
اپنا کوئی تیرا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل، یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

اس خط کا جواب تو یہاں وقت پر نہیں پہنچ سکے گا اس لئے اگلے خط کا انتظار کرنا۔ بہت سا پیار

فیض صاحب کا یہ خط غالباً سب سے زیادہ طویل خط تھا اور اس میں ان کا لہجہ بظاہر شاعرانہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت یہی ہے (یا میں نے شاید ایسا ہی محسوس کیا)، کہ اس خط میں ان کی روح کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ فیض صاحب کی روح اور ان کے اندر کے شاعر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ بیماری سے بھی یوں "مل جل" رہے تھے جیسے

مشاعرے کے بعد اپنے نوعمر مداحوں سے۔ کسی کو آٹو گراف دیا۔ کسی کا قلم کسی کو پکڑا دیا۔ بات کسی سے کی، نظر کسی پہ دوڑائی۔ مسکراہٹ کسی کو دکھائی اور اس مسکراہٹ کے دائرے میں کوئی اور آ گیا لیکن اس سے گریز یا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہر حال پیار، محبت اور شانتی بانٹ رہے تھے۔

میں نے دوستوں سے فیضؔ کی بیماری کا ذکر کیا، تشویش تو اپنی جگہ مگر اس کے ساتھ اکثر کا خیال تھا کہ فیضؔ صاحب جیسی شخصیت کی بیماری بھی تو خوش قسمت ہو گی۔ چنانچہ عموماً ایسا ہوتا کہ ہم ذکر تو ان کی بیماری کا کرتے مگر تذکرہ ہونے لگتا ہسپتال کے اس کمرے کا جہاں فیضؔ صاحب ہوں گے۔ ان درختوں کا جنہیں فیضؔ صاحب اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے ہوں گے۔ ان نرسوں کا جو معلوم نہیں فیضؔ صاحب کو کیسے دوا پلاتی ہوں گی۔ ان شعروں کا جو وہ سوچتے ہوں گے اور خوابوں کا جو ان کے رتجگوں کی دہلیز پر سو جاتے ہوں گے۔

چند روز یونہی بیت گئے۔ آخر فیضؔ صاحب کا ارسال کردہ VIEWCARD ملا:

پیارے سرفراز

امید ہے میرا خط تمہیں مل گیا ہو گا۔ چھ ہفتے ہسپتال میں رہنے کے بعد ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ سب کل پرزے تو درست ہو گئے ہیں لیکن اب کچھ وقت کسی سینی ٹوریم میں گزارنا ضروری ہے اس لئے اس خوبصورت اور تاریخی جزیرے میں بھجوا دیا ہے۔ ہم یالٹا سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ہیں اس لئے اس کارڈ پر اس محل کی تصویر ہے جس میں چرچل، روزویلٹ اور سٹالن نے یالٹا معاہدہ طے کیا تھا۔ ہم کل ہی اس میں گھوم کر آ رہے ہیں اور جن کمروں میں نہ جانے کتنے زمانے کے لئے دنیا کے سیاسی نقشے کا فیصلہ طے پایا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے واقعی تھوڑی سی ہیبت ہوتی ہے۔ تمہاری اور دیمی کی کیا خبر ہے؟ شاید اگلے مہینے لندن پہنچ کر بات ہو سکے۔ بہت سا پیار فقط

زندگی اگرچہ ایک خواب ہے لیکن مجھے یہ کسی خواب کی ادھوری تعبیر محسوس ہوتی ہے۔ میں ہر صبح دھوپ کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں مگر احساس رہتا ہے کہ یہ دھوپ شام کی ٹکل مار کر جدائی کی رسم نبھائے گی۔ پھر شام اور رات کو گلے ملتا دیکھ کر سوچتی ہوں یہ اپنی شال پہ جتنے چاہے چاند تارے سجالیں ۔۔ آخر کو مشرق سے پھوٹنے والی ایک کرن ان سب کو مات دے دے گی۔ ایسا کیوں ہے ؟ مجھے اس کی خبر نہیں۔ یہی حال ان احساسات اور محسوسات کا ہے جو میرے دل میں دوستوں کے لئے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے اب بھی خیال آتا ہے کہ جن دنوں میں نے فیض سے اپنے بیٹوں غالب اور ندیم کی شادی کا ذکر کیا تھا، تو انہوں نے حسب عادت سگریٹ کا لاپروا سا کش کھینچ کر اور دھواں اڑاتے ہوئے ہنس کر کہا تھا: ارے بھئی تم وہاں تک کیسے پہنچ گئیں ؟

میں نے ان کو جواب دیا: میں تو نہیں پہنچی، وہ پہنچے۔

تب انہوں نے مسکرا کر کہا: ہمارا مشورہ مانو تو مئی میں شادی نہ کرو، یہ گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پریشانی ہوگی اور پھر ہم بھی شاید نہ ہوں۔

اور پھر واقعی ایسا ہوا۔ فیض صاحب میرے بچوں کی شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن عین اس وقت جب اپنے دل کے ایک اُداس اور تنہا کونے میں انہیں کرسی پر بٹھا کر میں بارات کے ہمراہ چلی تو وہ اُدھر تیونس میں بیٹھے ہوئے یہ کارڈ لکھ رہے تھے:

عزیز سرفراز

دعا اور پیار۔ یہ تیونس ہے۔ دو دن پہلے یہاں پہنچے اور غالباً یہ ہفتہ یہاں گزرے گا، اگلے ہفتہ ماسکو میں مرمت کے لئے جانا ہوگا پھر لندن یونیورسٹی میں ایک تقریب ہے اور اس کے بعد ہمارے لوٹس میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈ کی میٹنگ ہے اس لئے بہت رنج ہے کہ تمہاری اور غالب کی خوشی میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہماری جانب سے دولہا، دولہن کو دعائیں اور تمہیں اور اقبال کو تہنیت پہنچا دیں۔ باقی ملاقات پہ سہی۔

سب کو بہت سا پیار۔ فقط فیض

یہ کارڈ مجھے ملا تو میں بے حد خوش ہوئی تھی مگر بعد کے دنوں میں یہ خوشی میرے لیئے ایک انتہائی اُداس اور پُر ملال حوالہ بن کر رہ گئی ہے کیونکہ یہ فیض صاحب کا میرے نام آخری خط تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ وطن واپس آ گئے تھے۔ ان کے اندر کے سچے اور خوبصورت شاعر نے وطن کی مٹی سے وفا کی آخری رسم نبھانے کی خوشبو پالی تھی۔

میں نے یہ خط تو پیش کر دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ کچھ حالِ دل بھی بیان کر ڈالا ہے مگر مجھے شدت سے احساس ہے کہ میں اس سکون، طمانیت اور محبّت کا کوئی کنارہ بھی اس کوشش کے دوران ظاہر نہیں کر سکی جو مجھے ان خطوط کی صورت میں یوں ملا جیسے دھرتی کو سات سمندر ملے ہیں۔ ان خطوط کی عبارت سانس لیتی، باتیں جواب دیتی اور لفظ چلتے پھرتے محسوس ہوتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے یہ خطوط نکالے اور پڑھنا شروع کر دیئے۔ وقت گزرتا رہا، آوازیں مدھم ہوتی گئیں اور کاغذ پہ سوئی ہوئی عبارتوں کے بدن زندہ ہو کر میرے سامنے آن بیٹھے۔ ان لفظوں میں سے کوئی فیض صاحب کی طرح سگریٹ پیتا، کوئی ان کی طرح مسکراتا، کوئی ان کے انداز میں سر ہلاتا، کوئی ہو بہو ان جیسی نگاہوں میں گفتگو کرتا، کوئی بالکل انہی کی طرح ماحول کو خوبصورت بناتا ــــــ میں فیض صاحب کی ان پرچھائیوں میں یوں گم ہو جاتی جیسے گھنے جنگلوں میں خوشبو۔

میں جب فیض صاحب کے ان خطوں، ان کی باتوں، ان کے لفظوں اور ان کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں ــــ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں یہی میرا زادِ سفر ہو گا ــ اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان، ایمان کا رُوپ دھار لیتا ہے کہ جب میری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہو گی تو حدِ نظر پر کسی مقدس سمت سے اچانک کوئی خوشبو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی: ارے بھئی! میرے خط کہاں ہیں، وہیں دنیا میں چھوڑ آئی ہو؟

کیا ایسا ممکن ہے؟ کاش ایسا ممکن ہو۔

17.IX.'80

۷-۱-۸۴

میری عزیز دوست ۔ سلامت رہیئے۔

آپ کا خط بڑے انتظار کے بعد کل شام ملا۔ مجھ کو تو آپ پہلے ہی دن بہت اچھی لگی تھیں جب آپ کے بنگلے پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں فیضؔ صاحب سے جب بھی ملنا ہوا تو آپ کی خیریت تو آپ کی خیریت ضرور پوچھ لیتا تھا۔ افسوس اس کا کہ لاہور میں آپ اور میں دونوں دو دن ایک ہی جگہ رہے لیکن آپ نہ جانے کس گوشے میں چھپی بیٹھی تھیں کہ مجھ کو نظر ہی نہ آئیں اور ملیں بھی اُس وقت جب آپ اسلام آباد جانے کے لئے کھڑی تھیں۔ اب دیکھیں آپ سے کب ملاقات ہو۔ ایلس کی بے رُخی کا شکوہ فضول ہے۔ وہ فیضؔ صاحب کی کسی چاہنے والی کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ یہ اُن کا احساسِ کمتری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ آپ دل میلا نہ کریں۔ میرے اچھے دوست! محبّت بہت لطیف بہت پاکیزہ جذبہ ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جن کو قدرت یہ جذبہ عطا کرتی ہے۔ وہ ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ نہ کسی سے محبّت کر پاتے نہ کوئی ان سے محبّت کرتا۔ مگر آپ تو ان خوش قسمت اور خوش خصلت انسانوں میں سے ہیں جن کو محبّت کرنا آتا ہے۔ مجھ کو کبھی کبھی فیضؔ صاحب پر رشک آتا تھا، اُن کو کتنا پیار اچاہنے والا ملا ہے۔ مگر وہ تو خود بہت ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ دلداری کی صلاحیت کہاں، لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو جہاں تک ممکن ہو ہلکا کر دوں کم کر دوں یا بانٹ لوں ــــ جی ہاں ان دنوں فیضؔ صاحب کے نام پر جو تجارت ہو رہی ہے میں اُس سے واقف ہوں۔ وہ جنہوں نے ساری عمر فیضؔ پر طعن و دشنام کے تیر برساتے اب فیضؔ کے سوگواروں میں پیش پیش ہیں مگر یہ یوں بھی ہوتا ہے۔ میں نے یہاں ایک تعزیتی جلسے میں یہی کہہ دیا تو ایک دو اخباروں نے مجھ کو بھی ہدف بنا لیا۔ خیر۔ ایں ہم اندر عاشقی آپ

اپنا خیال رکھیئے اور کاموں میں جی لگائیے۔ کاش آپ اتنی دور نہ ہوتیں۔ بہرحال آپ سے ملنے کی سبیل نکالنی ہی پڑے گی۔ ایلس سے ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ معلوم نہیں وہ یہاں کب تک ٹھہریں گی ــــــ اسلام آباد میں تو ان دنوں خوب سردی ہوگی۔ کاش ہم وہاں ہوتے تو آپ کے پاس بیٹھ کر آگ تاپتے اور اچھی اچھی باتیں کر کے آپ کا دل بہلاتے ــــــ

جواب کا منتظر

سبط حسن

۶-۱۲-۸۴

سوگوارِ فیض کو ہمارا سلام پہونچے

مجھ کو معلوم نہیں فیضؔ صاحب آپ کو کیا کہہ کر پکارتے تھے مگر میرے لئے یہی بہت ہے کہ وہ آپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ آپ ان چند خوش نصیبوں میں ہیں جن کی صحبت میں فیضؔ صاحب کا دُکھی اور درد مند دل دنیا کے تمام آلام و مصائب کو بھول جاتا تھا۔ آپ نے ان کی جس محبّت سے خدمت کی اور جو خوشیاں اُن کو دیں اُن کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناانصافی ہو گی۔ فیضؔ صاحب کو ہم سے جدا ہوئے دو ہفتے سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے لیکن تعزیّتی جلسوں، مضمونوں اور تقریروں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یہ مقبولیت تو علامہ اقبالؔ کو بھی نصیب نہیں ہوئی — جی چاہتا ہے کہ آپ پاس ہوں اور آپ کے ساتھ بیٹھ کر فیضؔ کی باتیں کرتا رہوں۔ ان کے اشعار آپ کو پڑھ کر سناؤں اُن کے قصّے بیان کروں اور آپ سے ان کی باتیں سنوں — کل آمنہ باجی سے دیر تک آپ کا تذکرہ رہا، کہنے لگیں، مجھ کو تو فیضؔ کے سب چاہنے والوں اور چاہنے والیوں سے پیار ہے۔ سرفراز سے کہو، وہ کچھ دنوں کے لئے میرے پاس آجائے۔ مجھ کو اُس سے بہت ہمدردی ہے۔

آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ یہ غم تو زندگی کے ساتھ ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اس غم کے ساتھ زندگی کرنے کا عزم کرلیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور اُن کی یادوں سے اپنے شب و روز کو منوّر اور معطّر کرتی رہیں۔ میں چودہ دسمبر کو دو ہفتے کے لئے دہلی ایک سیمینار میں جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے آپ کو فون کروں گا۔

خیر طلب

سبطِ حسن

۸۶-۱-۱۴

میری مہربان دوست۔ خوش رہو۔ مگر تم بتاؤ یہ کوئی دوستی ہوتی کہ نہ خط نہ ٹیلی فون۔ نہ تصویریں جن کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں صبح شام اپنے ڈاک کے ڈبے کو کھولتا ہوں کہ شاید تمہارا کوئی خط ہو مگر ناکامی ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم فیض صاحب کا احسان کبھی نہ بھولیں گے جن کی بدولت تم سے ملنا نصیب ہوا ورنہ اتنے بھرے دربار میں اس فقیر گوشہ نشین کی رسائی محال تھی۔ کئی دن سے تم بہت یاد آرہی ہو۔ کل جی بہت گھبرایا تو "نسخہ ہائے وفا" کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پھر شعر گنگناتے گنگناتے کچھ مصرعے بننے لگے۔ بس تُک بندی کی ہے اور شاعری کا خون کیا ہے بہرحال جس کی یادوں نے یہ اُلٹے سیدھے شعر کہلوائے ہیں اُسی کی نذر ہیں:

میرے محبوب کے ہونٹوں کی مٹھاس!
میرے محبوب کے ہونٹوں کی حرارت!
لبِ گویا! تری شیرینیٔ گفتار کہاں سے لاؤں؟
تیرا اندازِ تکلّم
جس سے خوشبوئے وفا آتی تھی
چاہت کی مہک، پیار کے پھول
اُلفت و مہر کا مژدہ لائے
عہد و پیمان کا نغمہ جن کو
میرے کانوں نے سُنا
میری آہوں نے سُنا
اور قلبِ مُضطر نے تسلّی پائی

میرے غم خانے میں یہ کون آیا
آیا اور درد کا درماں بن کر
مجھ کو سرافراز کیا
خوشبوؤں کا در باز کیا

اور اب یادوں کی سب رنگ دھنک
تجدیدِ ملاقات کا ارماں بن کر
اُن کی بانہوں کی طرح
میری فرقت کے شب و روز کو
اپنی آغوشِ محبت میں سکوں بخشتی ہے

تم کو شاید یاد ہو کہ یہاں دفتر میں بیٹھ کر ہم لوگوں نے بہت سی سنجیدہ باتیں کی تھیں اور تم نے اپنے آئندہ مشغلوں کے بارے میں غور کرنے کا وعدہ کیا تھا تو کیا غور کرنے کی فرصت ملی یا دن رات ابھی تک مہمان نوازی ہی میں صرف ہوتے ہیں۔ فیض صاحب نے بڑی سچی بات کہی تھی : ؎ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں عشق کی چاہت کے سوا

غمِ عشق بہت خوبصورت شے ہے، اس میں کوئی کلام نہیں لیکن زندگی فقط عشق ہی تو نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے، عشق اُسی وقت دو آتشہ ہوتا ہے جب غمِ ذات کے ساتھ غمِ زمانہ بھی شامل کر لیا جائے۔ اچھا جناب لکچر ختم۔ اب یہ بتائیے کہ کیا کرتی رہتی ہیں۔ وہاں سردی تو خوب ہوگی۔ یہاں بھی ہلکی سی لہر آئی ہے لیکن یہ سردی تو مانگے تانگے کی ہے۔ اس کا کیا اعتبار۔ یاد ہے اس دن تو سمندر کے پاس

تم کو پسینہ آرہا تھا۔ کانفرنس کی تیاریاں جاری ہیں۔ ۶، ۷، ۸ مارچ کو تم کو یہاں ضرور آنا ہے بھولنا نہیں۔ سارا انتظام ہمارے ذمے۔ میں اسلام آباد آنے کے لئے بہت بے چین ہوں۔ دو تین دن میں فیصلہ ہو جائے گا تو تم کو فون سے اطلاع دوں گا۔ جواب جلد اور ہاں تصویریں ضرور بھیجو۔ میں پرنٹ نکلوا کر واپس کر دوں گا۔ مگر رجسٹری بھیجنا۔

تمہارا

سبطِ حسن